بسلسلۂ صد سالہ یادِ انیسؔ

انیس اور مرثیہ

زندگی اور پیام

مقالات و مضامین

سیّد مرتضیٰ حسین فاضل

ناشر

سیّد عابد مرتضےٰ - حرمت اسٹریٹ مغل پورہ
لاہور
(پاکستان)

ب

قیمت چھ روپیہ

فیاض پریس لاہور

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ان محترم دوستوں کے نام جن
کی بدولت انیسؔ کی صد سالہ
یاد میں یہ کتاب ادبی
حلقوں میں پیش کی گئی۔

ناچیز؛
مؤلف

فہرست

الحاج مولانا سید مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

ادب زندگی کو حسن بخشتا ہے۔ ادب سے ذہن کو توانائی ملتی ہے۔ کسی قوم کی عظمت اس کے ادب سے معلوم ہوتی ہے۔ پاکستان کی قومی زبان کا سرمایہ بھی پاکستانیوں کی وسعت فکر اور بلندئ کردار کا آئینہ دار ہے۔ ہمارا تاریخی پس منظر تابناک اور سیاسی ماضی شاندار ہے ہم نے پانچ سو برس اسلامی عقائد و اخلاق کی تبلیغ میں گذارے اور پانچ سو برس تک ایک وسیع خطے پر حکومت کی، ہزار سال کی طویل جد وجہد میں ہم نے یہاں کے دور جاہلیت کو نئے تمدن سے سربلند کیا ظاہری لباس سنوارا۔ باطنی مزاج بدلا۔ اندرونی حسن تعمیر وطرز رہائش کو خوبصورت بنایا۔ بیرونی دنیا سے روابط پیدا کئے۔ نئی زبان دی اور اعلیٰ درجے کے فلسفۂ حیات کو عام کیا۔ پتھروں اور درختوں کے خدائی بھرم کو توڑا۔ اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کروائی۔ اللہ کے آخری پیغام اور دین حق، اسلام کا پابند کیا۔ آخر مسلمانوں نے اس خطے کی تقدیر بدل دی۔ آدمیوں کو انسانیت اور انسانوں کو کردار کا سبق دیا پرانے علوم کو نیا لہجہ اور نئے لہجے کو نئے ادب کی دولت گراں بہا عطا کی۔

اردو زبان مسلمانوں کی عظیم کامیابیوں کا نشان ہے۔ یہ زبان مسلمانان برصغیر کی وحدت کا نشان ہے اور اس زبان کا معیاری ادب ہمارے عظیم ادیبوں کا بہت قیمتی ورثہ ہے۔ موجودہ دور افکار کی جنگ اور تمدنوں کی لڑائی سے عبارت ہے اس عہد میں جو قوم بھی احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اپنے ادب، اپنے تمدن، اپنے ماضی اور اپنے ورثے سے غافل ہوئی وہ کچل دی جائے گی۔ حریف تو ہیں چودہ سو برس کے فلسفۂ حق وصداقت سے لوگوں کا رخ موڑ کر دو ہزار برس کی طرف

لیجانا چاہتی ہیں۔ کہتے ہیں اسلام ایک پرانا نظام ہے۔ اس ترقی یافتہ زمانے میں
اس آئین و دستور کا حوالہ رجعت پسندی ہے۔ آؤ موہنجوڈڑو۔ ہڑپا۔ کپل وستو اور اجنتا
چلو۔ وہ وقت یاد کرو جب سندھ اور جہلم گنگا جمنا کے دریاؤں کے کناروں پر
آریا آئے تھے۔ ان کے کھنڈر دیکھو ان کے ہر کٹے مجسمے اور پاشکستہ کھلونے سے
اپنے ڈرائنگ روم آراستہ کرو۔ ان ٹیڑھے سیدھے مفروضہ حروف و عبارات
سے آگاہی حاصل کرو تاکہ تم پائیدار قومیت حاصل کرسکو۔ روشنی سے اندھیرے کی
طرف پلٹو گے تو حریف کو اپنی ٹمٹماتی شمعیں اور ایٹم کی چکاچوندھ کرنے والی شعاعوں
کے ذریعے آنکھوں سے نور اور دل و دماغ سے شعور چھین لے اور مسلمانوں کو جذب
دروں سے خالی کرکے بے حس و حرکت کردے۔ مگر اللہ کا وعدہ حق اور اسلام کی
زندگی موت کی زد سے دور ہی رہے گی۔

انیس، اردو کے بہت بڑے شاعر اور اخلاق و کردار انسانی کے ماہر مفکر
ہیں۔ میر ببر علی انیس مسلمان قلب و نظر کے مالک تھے انہوں نے اسلام کے حیات
آفرین واقعے کو اپنا موضوع کلام بنایا۔ امام حسین علیہ السلام کی شہادت سے اثرپا۔
اس واقعے کو پڑھا اور سمجھا پھر اس کی نور پاشی۔ حیات آفرینی اور انسانی اقدار کے
سبق محفوظ کرکے اپنے لہجے اور عام فہم اسلوب میں اپنے استفادے کو بیان کیا ان
کا نام مفکر و شاعر کے بجائے "مرثیہ گو" مشہور ہوا۔ ان کی شاعری۔ "مرثیہ گوئی" کہلائی
انہوں نے اردو ادب کو حیرت انگیز سرمایہ دیا۔ انیس نے مرثیہ کو اعلیٰ علمی، اخلاقی
فکری اور عملی معیاروں کے سامنے پیش کیا اور لاجواب کامیابی حاصل کی۔ ان کی
روشن شمع کے پروانوں کی تعداد بڑھتی گئی ان کے چراغ سے چراغ جلائے گئے
ان کا اسلوب زبان کی وسعتوں کا پیمانۂ ترقی ہے۔

دوستوں کو معلوم ہے کہ میں نے غالب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور غالبیات میں
کچھ نہ کچھ قابل ذکر خدمات بھی انجام دی ہیں۔ عود ہندی، اردوئے معلّی اور کلیات
غالب فارسی کے متن جس محنت سے مرتب کرکے اہل نظر تک پہنچائے اس سے

جس طرح لوگوں نے فائدے اٹھائے وہ سب کے علم میں ہے۔ خیام پر ضخیم کتاب "احوال و رباعیات خیام" بھی چھپ چکی ہے۔

عربی کے مشاہیر شعراء اسلام پر طویل و ضخیم کتاب مکمل صورت میں منتظر اشاعت ہے اردو میں ناسخ و ذوق و آتش پر چھوٹی کتابیں بھی بازار میں ملتی ہیں۔ کلیات آتش کی اشاعت بھی ہو چکی اور شیخ جان محمد شاد پہیر و میر تقی میر پر مفصل مقدمہ لکھا۔ غالب و آتش پر مستقل دو کتابیں تیار رکھی ہیں۔ یہ سب کچھ ادبی مطالعے کے حوالے انیس پس منظر ہیں۔ حسن اتفاق کہ "مجلس ترقی ادب لاہور" کے ناظم اور منتظم حضرات نے ادب کی کساد بازاری کے خلاف خالص علمی اور قومی نقطۂ نظر سے اردو کلاسیک کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ اور ہمارے قومی ادب و ثقافت کا بہت بڑا حصہ شائع کر کے علمی دنیا تک پہنچایا۔ مجلس نے غالب و اقبال کے صد سالہ تقریبات میں وقیع کتابیں پیش کی ہیں اور اب انیس کی صدی کے مرحلے میں بھی۔ موازنۂ انیس و دبیر۔ کے بعد۔ جواہر انیس میں سے بارہ مرثیے چھاپ کر تقریبات یاد انیس میں اولیت حاصل کی اور ایک خوبصورت پیش کش کا یادگار اضافہ کیا۔

انیس کے مرثیوں پر میں نے متعدد مضمون لکھے تھے اب نفیس و نادر قلمی مطبوعہ مرثیوں کے لئے جو طویل مطالعہ کیا اور تقریبات انیس کے سلسلے میں جو مقالات لکھے تو دل چاہا کہ انہیں بھی یکجا کر کے خود بھی ایک گلدستہ پیش کر دوں۔

میں اپنے ان مخلص اور بزرگ دوستوں کے لئے سراپا سپاس ہوں جن کے تعاون اور جن کی مالی کمک نے خیال کو عمل سے روشناس کیا اور دوستان انیس کے لئے یہ تحفہ پیش کئے جانے کے قابل ہوا۔

"انیس اور مرثیہ"، میرے گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں چھ مضمون انیس سے متعلق ہیں۔ ایک انیس کے والد میر مستحسن خلیق کے بارے میں ہے ان مضامین میں انیس کے سماجی پس منظر۔ انیس کے فکری تجزیئے انیس کے ادبی و اخلاقی نظریات و پیام

کا بیان ہے۔ انیس کی شاعری کو پرکھا گیا ہے۔ اس کے مثبت تاثرات کو قلمبند کیا ہے اور تنقید و تعارف فن کے لئے چھان بین کے نتائج دوستوں کو پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان مضامین میں اہل نظر کو زندگی اور پیام، کے کچھ نئے پہلو ملیں گے۔

انیس کے بعد مرثیہ کی روایت آگے بڑھی اور پاکستان میں مرثیہ گوؤں نے نیا تیور اختیار کیا ہے۔ اس روایت کے زندہ شاعر جوش ملیح آبادی۔ آل رضا، نجم آفندی۔ نسیم امروہوی صف اول کے بزرگ ہیں۔ دوسری صف میں لاہور کے قیصر بارہوی، وحید الحسن ہاشمی، ڈاکٹر خاکی، افسر زیدی متعدد مرثیے لکھ چکے ہیں۔ قیصر صاحب نے تو شہرت و فن میں ایک مقام بھی حاصل کر لیا ہے اس کے علاوہ جناب فیض الحسن فیضی (راولپنڈی) آغا سکندر مہدی (بہاولپور) خلش (بھکر) کے مجموعۂ مراثی بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔

کراچی میں مرثیہ گو حضرات کی تعداد اور اہمیت بہت زیادہ ہے۔ جناب ضیاءالحسن موسوی، شاہد نقوی۔ ڈاکٹر یاور عباس صاحب اور نفیس فتحپوری کے مرثیے میں نے دیکھے اور سنے ہیں ان کے علاوہ دوسرے اکابر کا کلام بھی قبول عام اور پسند کی سند لے چکا ہے۔ جناب ڈاکٹر صفدر حسین اعلیٰ درجے کے مرثیہ گو ہونے کے ساتھ نقاد اور محقق بھی ہیں اور تاریخ مرثیہ پر متعدد کتابوں کے مصنف ہیں ان کے تنقیدی اور علمی تالیفات ادبی حلقوں میں عام ہیں۔ میں نے اتفاقاً صرف تین حضرات پر ایک ایک مضمون لکھا ہے یہ مضمون بھی چونکہ نئی نسل اور مرثیہ سے متعلق تھے اس لئے انہیں بھی شریک اشاعت کر لیا ہے۔

سید مرتضیٰ حسین فاضل لاہور

۷ر نومبر ۱۹۷۴ء۔

میر مستحسن خلیق

انیس کے نامور والد بزرگوار، میر حسن کے دوسرے فرزند امیر مستحسن
خلیق خاندانی شاعر تھے۔ کئی پشتوں سے شعر و سخن کے سلسلے نے انہیں اپنے
عہد کا نام بر آوردہ شاعر بنا دیا تھا۔ ان کے پردادا ہنس مکھ، شگفتہ مزاج،
طباع شاعر تھے۔ سودا کے مقابلے اور اس عہد کے ماحول نے ضاحک کو ہزل گو
مشہور کر دیا تھا ایک طرف سنجیدہ شاعری میں حاتم، مصحفی، درد، سوز
میر تقی میر، اور سودا کا چرچا تھا۔ دوسری طرف میر جعفر زٹلی کی ڈگر آگے
بڑھ رہی تھی۔ اور اس میں سودا، ضاحک، انشاء جرأت اور کبھی کبھی
میر مقابلے کر رہے تھے۔ میر ضاحک کا دیوان کلیات و غزل، وغیرہ پہ مشتمل ہے
مگر انہیں غزل گوئی میں شہرت نہ ہو سکی۔ حسن اتفاق سے ان کے بیٹے میر حسن
خوش اخلاقی، شستہ مزاجی، اور طباعی کی بنیاد پہ جدید شعری رجحانات کے
ترجمان نکلے۔ میر حسن کی غزل اور مثنوی سادگی روانی، تسلسل و عکاسیٔ دل کشی
اور حقیقت نگاری کی وجہ سے بے حد مقبول ہوئی۔ میر حسن اپنے زمانے کے
بھاری بھرکم لہجے اور زبان و بیان کے مصنوعی اسلوب کے خلاف تھے
ان کی سادہ پسندی روز افزوں شہرت کا باعث بنی۔ اور مثنوی میں وہ
سب سے بلند مرتبہ شاعر قرار پائے۔

میر حسن کے کم از کم تین فرزند تھے۔ خلق، خلیق اور مخلوق، ان میں خلیق
نے مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی میں نام پایا۔

ولادت :- میر مستحسن خلیق کی پیدائش دہلی میں ہوئی - یا فیض آباد میں ہوئی ؟ اور تاریخ ولادت ۱۱۸۱ھ ہے یا آگے سجھے تذکرہ نگا- اس کا جواب نہیں دیتے- چھان بین سے تذکرہ ھندی میں خلیق کا نام لیا اور مصحفی نے اس کتاب کی تالیف کا انہیں محرک بتایا ہے تذکرہ ہندی کی تالیف ۱۱۹۹ھ سے ۱۲۰۹ھ تک جاری رہی- اسی اثنا میں مصحفی نے لکھا ہے -

"میر احسن خلق، خلفِ میر حسن صاحب، جوان خوش ظاہر، باعلم وحیا ہیں موروثی موزونی طبع کی وجہ سے کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں اور اپنے والد بزرگوار کو دکھاتے ہیں - اس وقت ان کی عمر انیس سال ہے (تذکرہ ہندی ص ۸۹)
اگر مصحفی نے یہ حالات ۱۱۹۹ھ میں لکھے ہیں تو خلق کی تاریخ پیدائش تقریباً ۱۱۸۰ھ میں معین ہو سکتی ہے- آگے بڑھ کر صفحہ ۹۰ پر تحریر ہے -

"میر مستحسن خلیق برادر خورد میر احسن"

خیال ہوتا ہے کہ خلق و خلیق کے حالات ایک ہی وقت میں قلمبند ہوئے ہیں، لہٰذا اگر خلق ۱۱۸۰ھ میں پیدا ہوئے تو ۱۱۸۱ھ کے بعد- یعنی تذکرے کی تالیف کے وقت سترہ اٹھارہ سال کے تھے- اتنے نوعمر شخص کی فرمائش سے اس قسم کی زحمت طلب کتاب کا لکھنا حیرت کی بات ہے- مصحفی کی عبارت ہے

"اما بتکلیف میر مستحسن خلیق خلفِ میر حسن کہ باشارہ پدر بزرگوارِ خود کلام خود- را از نظر فقیر می گذراند و شوق شعر ہندی دامن دلش را محکم فرا گرفتہ طوعاً و کرہاً قدم دریں بادیۂ پر خار گذاشت "
مصحفی نے میر حسن کے احوال میں یہ اشارہ بھی کیا ہے کہ میر صاحب بارہ سال کی عمر میں پورب فیض آباد آئے- اس سے گمان ہوتا ہے کہ میر مستحسن

خلیق کا سنہ ولادت ۱۱۸۳/۸۱ھ کے مابین ہے مقام پیدائش فیض آباد ہے

تعلیم و تربیت:- فیض آباد میں علماء و فضلاء کا مجمع تھا اور میر حسن نواب بہو بیگم اور نواب سردار جنگ کی سرکار سے وابستہ، لہٰذا ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے کسی مدرسے یا مکتب میں جانا ممکن تھا۔ نواب سالار جنگ اور ان کے فرزند سردار جنگ لکھنؤ بھی آتے جاتے تھے۔ میر حسن کی آمد و رفت لکھنؤ بھی جاری تھی، ہو سکتا ہے کہ بچپنے ہی سے خلیق لکھنؤ میں آتے جاتے اور رہتے سہتے ہوں اور کچھ فارسی و عربی ان دونوں شہروں کے اساتذہ اور اپنے عزیزوں سے پڑھی ہو۔ اسی کم سنی میں موزونی طبع رنگ لائی اور الٹے سیدھے شعر لکھنا شروع کئے سولہ برس کے ہوئے تو بقول مصحفی "درست و نادرست" اشعار والد کو دکھانے لگے۔ میر صاحب بڑھاپے اور ضعیفی کے مرحلے میں تھے۔ ادھر مصحفی آ گئے۔ میر حسن نے فرزند کو ان کی شاگردی میں دے دیا۔ مصحفی کہتے ہیں "میں نے اسی زمانے میں کہہ دیا تھا کہ اگر دنیا نے مہلت دی تو خوب کہے گا۔" (تذکرہ ہندی ص ۹۰)

ان کی کم سنی کے شعر ہیں:

جس گھڑی تم کو نہیں پاتے ہیں ہم — جی ہی جی میں اپنے گھبراتے ہیں ہم
سر جھکا لیتا ہے لالہ شرم سے — جب جگر کا داغ دکھلاتے ہیں ہم

ان دو شعروں کے علاوہ پندرہ بیس شعر اور مل سکے ہیں۔ یہ سب شعر خلیق کی ابتدائی مشق سخن کی یادگار ہیں ان سے خلیق کا مزاج اور شعری اسلوب کا خاکہ سمجھ میں آتا ہے یعنی ان کی غزل شگفتہ، خیالات صاف اور نازک زبان با محاورہ اور روزمرہ کی ہے۔

اشک جو چشم خونفشاں سے گرا — تھا ستارہ کہ آسماں سے گرا

آتشِ گل پہ جل کباب ہوا | رات بلبل جو آشیاں سے گرا
شیشۂ دل تو چور ہو جاتا | کوئی پتھر نہ آسماں سے گرا
میں نے آنکھوں سے لے لیا اس کو | پھول جو دستِ باغباں سے گرا
ہنس دیا یار نے جو رات خلیقؔ | کھا کے ٹھوکر اس آستاں سے گرا

مشاغل و مصروفیات: مشرقی قدیم روایت کے مطابق جب تک شفیق باپ زندہ ہے، بیٹے آزاد و بے فکر زندگی گذارتے ہیں، خلیق تو ابھی تو عمر ہی تھے۔ کھیلنے اور پڑھنے کے دن، اتنے میں محرم ۱۲۰۱ھ میں والد کا انتقال ہو گیا۔ معلوم نہیں میر حسن کے بعد گھر کا سربراہ کون ہوا۔ اور خلیق کی شادی بیاہ کس نے اور کہاں کی۔ تذکرۂ ہندی گویاں" کی روایت ہے کہ خلیق کسی لشکر کے ساتھ رہے اور کسی سفر پر بھی گئے۔ گویا انہوں نے سپاہیانہ زندگی بھی گذاری۔

۱۲۰۹ھ میں نواب آصف الدولہ نے رام پور کی مہم میں مصروف تھے ممکن ہے، میر خلیق اسی مہم میں کسی پلٹن میں نوکر ہو گئے ہوں۔ ۱۲۱۲ھ میں آصف الدولہ نے رحلت کی اور وزیر علی خان کا ہنگامہ ہوا۔ خلیق اس ہنگامے سے متاثر ہوئے ہوں تو بعید نہیں۔ اس کے بعد فوج کی اہمیت نہ رہی سیاسی طور پر انگریزوں نے فوجی امداد کا ایسا منصوبہ بنایا۔ جس نے ملک کی فوجی تنظیموں کو بے معنے کر دیا۔ بہر حال میر تقی میر کی طرح تلوار رکھ کر قلم اٹھا لیا فیض آبادی میں، نواب بہو بیگم صاحبہ نے زبان کا محکمہ قائم کیا تھا۔ اس محکمہ میں میر صاحب کے والد ملازم تھے۔ محمد مہدی صاحب فیض آبادی (مولود ۱۹۰۳ء) کہتے ہیں کہ موتی محل جو شاہی محل کہلاتا تھا۔ اس کے مشرقی پھاٹک کے سامنے اب ایک میداں ہے۔ میدان میں مکانوں کا ڈھیر ایک ٹیلہ بن چکا ہے۔ یہ ٹیلہ

موجودہ پھاٹک کے مغربی سمت میں ہے سنا ہے وہیں میر خلیق کا مکان تھا اور پھاٹک سے اندر بائیں ہاتھ پر آغا ابو صاحب کا آبائی محل تھا۔ سید محمد صاحب رند کا مکان نخاس میں دیکھا ہے۔"

مولانا آزاد کے بقول میر خلیق، نیشاپوری خاندان کے رئیس (اسد الدولہ، آغا محمد تقی خان بہادر فیل جنگ) ترقی کے یہاں پندرہ روپے ماہانہ کے ملازم ہو گئے۔

خلیق پختہ عمر ہو چکے تھے۔ نواب سید محمد خان رند اور میر اوسط علی رشک جیسے نوعمر اور جوان غزل گو ان کے شاگرد ہوئے۔ مرزا محمد تقی "رئیس با کرم سرداد باحشم، شمع انجمنِ افروز" (خوش معرکۂ زیبا) تھے۔ ان کے یہاں مشاعروں میں اہل کمال دادِ سخن دیتے تھے۔ خلیق نے معرکے کی غزلیں کہہ کر سند لے لی کہ فیض آباد میں میر خلیق سے بہتر کوئی شاعر نہیں۔

۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۴ء کے لگ بھگ ببر علی انیس کی ولادت ہوئی۔ اس وقت تک نواب بہو بیگم کا دربار قائم تھا۔ نوابین نیشاپور اور اقربا، سرکار کا دور دورہ تھا۔

وابستگانِ دولت کو لکھنؤ سے بے نیازی تھی۔ فیض آباد باوقار شہر تھا ۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۴ء میں نواب امۃ الزہرا، نواب بہو بیگم صاحبہ نے رحلت کی فیض آباد کا سہاگ اجڑ گیا۔ لوگ جوق در جوق لکھنؤ منتقل ہونے لگے، نوجوان شعرا بھی لکھنؤ چلے گئے۔ رند نے خلیق کو چھوڑ کر آتش سے اور رشک نے ناسخ سے اصلاح لینا شروع کی۔ اس افراتفری میں خلیق بھی خانہ بدوش ہو گئے۔ لکھنؤ کی آمد و رفت بڑھ گئی، یہاں ان کے محسن دوست احباب، خاندانی قدردان اور فیض آبادیوں کا مجمع تھا۔ کہتے ہیں ایک عرصہ تک وہ راجہ ٹکیٹ رائے کے خاندان میں بچوں کے اتالیق بھی رہے۔ اور غالباً مفتی گنج والے مکان میں قیام کیا۔ اس کے بعد محلہ ستھی؛ قریب ڈیوڑھی

آخاامیر میں آباد ہوئے۔ مولانا آزاد کی روایت ہے کہ "میر خلیق نازک خیالوں میں ذہن لڑا رہے تھے کہ باپ کی موت نے شیشے پر پتھر مارا۔ جس نے امید کے چشمے خاک ریز کر دیئے۔ مگر ہمت کی پیشانی پر ذرا بل نہ آیا۔ اکثر فیض آباد میں رہتے تھے۔ لکھنؤ آتے تھے تو پیر بخارا[2] میں ٹھہرا کرتے تھے۔

پرگوئی کا یہ حال تھا کہ مثلاً ایک لڑکا آیا اس نے کہا: میر صاحب! آٹھوں کا میلہ ہے، ہم جائیں گے۔ ایک غزل کہہ دیجیے! اسی وقت ایک غزل لکھ دی اس نے کہا یاد بھی کروا دیجیے، میر صاحب اسے یاد کروا رہے ہیں رواج کے مطابق غزلیں قیمتاً بھی لکھتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی نے میر صاحب سے غزل لی اور ناسخ کے پاس جاکر کہا استاد غزل پر اصلاح دے دیجیے، شیخ صاحب نے غزل پڑھ کر اس کی طرف دیکھا۔ اور بگڑ کر کہا: یہ تمہاری غزل ہے؟ ہم زبان پہچانتے ہیں یہ وہی پیر بخارا والا ہے (آبِ حیات)

لکھنؤ کے ترقی پذیر معاشرے میں غزل گو شاعروں کا ایک گروہ ایسا نکلا جو مشقِ سخن اور مہارتِ فن کے بعد مرثیے کی طرف مائل ہوا۔ یہ لوگ قدر دانی کی نظر سے دیکھے گئے۔ ان کی شاعری کو مذہبی تقدس کا رشتہ ہاتھ آیا ظاہری مشاہدات اور قلبی جذبات و احساسات میں کتنی ہی متناطیسیت بھری ہو اس کا مستقبل بہر حال فنا پذیر ہوتا ہے۔ صحرائی انسانوں کو پہاڑی مناظر اور پہاڑی باشندوں سے میدانی حسن کی بات کہی تو جا سکتی ہے لیکن اثر میں یکسانیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ عقل و فکر کی شاعری ہر عقل مند کے لیے قابلِ توجہ ہے مگر فکر و نظر کا معیار بدل جائے تو شعر بے معنی اور

---

[1] :- دیکھئے "دراثیس کا تاریخی ماحول ......"

[2] :- پیر بخارا مفتی گنج سے دور نہیں تھا۔

مہمل نام ہو سکتے ہیں، عقیدہ لازوال حقیقت ہے۔ اگر جذبہ و فکر میں عقیدے کو شریک کر لیا جائے تو فنون و تخلیقات میں دور رس اثر آفرینی پیدا ہو جاتی ہے۔

اودھ کی تہذیبی روایت دو پہلو رکھتی تھی۔ ایک دولت اور سخاوت کی چمک دمک سے جگمگاتا رخ جس میں تکلف، تصنع، نفاست اور نزاکت کے ساتھ بھاری بھرکم پن بھی تھا۔ دوسرا اجتہادی پہلو۔ اس پہلو سے اودھ کی تہذیب اور اسلامیات برصغیر کی تاریخ کا روشن باب شروع ہوتا ہے۔ اودھ نے مذہب کو بڑی اہمیت دی۔ اس نقطۂ نظر سے جو اعلیٰ اخلاقی اور ثقافتی، ادبی اور تعمیر کام انجام دیئے گئے۔ ان میں "مرثیہ" کا شمار شاہ کاروں میں ہوتا ہے۔

آصف الدولہ کے بعد لکھنؤ میں مرثیے کی قدیم روایت کو بڑا احترام رہا۔ فصیح دگیرا، احسان و افسردہ آغا اور افسر، فصیح و دلگیر کی بڑی عزت تھی۔ میر مستحسن خلیق چونکہ خاندانی شاعر اور مرثیہ گو سلسلے سے تعلق رکھتے تھے اس لئے جب انہوں نے غزل کو سلام کیا اور مرثیہ گوئی کو فن بنایا تو سب نے پذیرائی کی۔

خلیق کا مرثیہ

اہل نظر جانتے ہیں کہ "مرثیہ" کی ہئیت قدیم زمانے میں معین نہ تھی قطب شاہی و عادل شاہی دور کے مرثیے ہمارے دور کے سادہ نوحوں اور سلاموں سے ملتے جلتے ہیں۔ اس کے علاوہ مثنوی کے طرز میں بھی مرثیہ لکھا گیا۔ کم و بیش سو برس بعد یہ روایت دہلی میں آئی اور محمد شاہی دور میں مرثیہ تسلسل بیان اور ہئیتی سانچوں میں ڈھالا گیا۔ سلام و غزل کی بناوٹ کے علاوہ مخمس، ترجیع، تربیع و مسدس کو بھی زیر مشق لایا گیا۔

میر و سودا، مسکین و ندیم، سکندر و مذنب دہلی سے لکھنؤ پہنچے تو اپنی روایت لے کر گئے۔ جب زبان و بیان میں تبدیلیاں ہونے لگیں۔ تو ہیئت

پر بھی دھیان دیا گیا۔ اور پچیس تیس برس بعد کچھ لوگوں نے مسدس کو قبول کر کے ایسا رواج دیا کہ مرثیہ کے لئے یہی ہیئت سکۂ رائج الوقت قرار پائی مرثیہ کا اظہار، مدتوں سے لَے اور سُر کے ساتھ ہوتا تھا۔ اب دینی حلقوں نے اس پر گرفت کی تو سوز خوانی فقاہت کے خلاف قرار پائی اور مرثیہ کو لَے اور سُر سے آزادی ملی، ایک نیا انداز ایجاد ہوا، مرثیہ خواں نے خطابت اور تیور سے کام لے کر ایک طریقۂ خوانندگی پیدا کیا۔ جسے "تحت اللفظ" کا نام ملا۔ مرثیہ گو خود اپنا کلام یا کسی غیر کا مصرعہ ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتا۔ لوگ توجہ سے سنتے، پسند کے موقع پر داد دیتے، درود کی جگہ صلوٰۃ پڑھتے تھے۔ اور گریے کے وقت روتے تھے۔

عام طور سے مرثیہ تیس سے چالیس پچاس بندوں کا ہوتا تھا۔ انیس کی جوانی اور خلیق کے بڑھاپے میں یہی تکنیک رائج تھی۔ اور ایک ہی اسلوب و ہیئت کے مرثیے لکھے اور پڑھے جاتے تھے۔ ہم نے اِن بزرگوں کے مرثیے دیکھے ہیں۔ ان میں زبان و بیاں کا ارتقا ہے۔ اظہار و ابلاغ کا حسن ہے۔ شعر و فن کی استادانہ مرصع کاری ہے۔ ضمیر و خلیق نے اِس میں سادگی و درد کا اضافہ کیا۔ خلیق کے یہاں سادگئ زبان و بیان کے علاوہ پڑھنے کا انداز بہت پسند کیا گیا۔ ضمیرؔ و خلیقؔ دونوں مصحفی کے شاگرد زمانے نے دونوں کو مقابل ٹھہرایا۔ پروفیسر مسعود حسن ادیب کے پاس خلیق کے سو سے زیادہ مرثیے ہیں۔ اور شبلی کے خیال میں بہت سے ایسے مرثیے ہیں کہ ان کی زبان اور انیس کی زبان میں فرق نہیں محسوس ہوتا۔ ضمیر کے مرثیے چھپ چکے ہیں اور انہیں قبولِ عام بھی حاصل ہوا۔

ایک مشہور روایت ہے کہ میر مظفر حسین ضمیر نے ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء میں مرثیہ کی ہیئت و اجزاء میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ چہرہ، رخصت، سراپا، گریز، اور جنگ کے عنوانات کا اضافہ کیا۔ اہلِ تحقیق اِس روایت کو معتبر نہیں جانتے مگر یہ سب

مانتے ہیں کہ ضمیر و فصیح دلگیر نے کچھ وسعتیں پیدا کیں۔ شاید ضمیر کا مرثیہ

کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے

نئے امکانات کا خوبصورت تجربہ ہو۔ اس سنہ میں میر خلیق کی عمر تقریباً ساٹھ سال اور ضمیر کی عمر تقریباً پچاس سال، دبیر تیئس اور انیس چونتیس برس کے لگ بھگ ہوں گے۔ خلیق و ضمیر کے مرثیوں کا نہ تو کوئی تحقیقی و تاریخی مجموعہ ہے نہ ان پر کوئی تفصیلی بحث میری دسترس میں ہے لیکن یہ کہنا غلط نہیں کہ خلیق و ضمیر نے مرثیہ کی اکائی، اس کی ترکیب و اجزاء، اس کے اسلوب اور خاکہ کو جہاں پہنچایا تھا۔ دبیر و انیس نے اسی ڈھانچے کو آب و تاب سے نئی توانائی و تازگی بخشی۔

میر مستحسن خلیق نے لکھنؤ میں وفات پائی اور قطعۂ تاریخِ وفات خواجہ مصاحب علی راوی نے یہ لکھا۔

میر خلیق نکتہ سنج دارِ فنا کو چھوڑ کر
خلق کے دل پہ کوہِ غم اپنے الم کا دھر گئے
راوی خستہ حال نے فکر جو فرطِ غم سے کی
ہاتف غیب نے کہا میر خلیق مر گئے

۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء خلیق کا سنہ وفات ہے (تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا صفحہ ۲۹۵)

میرے کتب خانے میں خلیق کے دو مرثیے ہیں

۱- قاسم بنا مسند پر جب بن کے بنا بیٹھا۔

۳۴ بند۔ تحریر اندازاً ۱۲۵۰ھ۔ یہ مرثیہ لاہور کے ماہنامہ پیام عمل، انیس نمبر ۱۹۷۲ء میں چھپ چکا ہے۔

۲- جب علمدار کو میداں کی اجازت نہ ملی

۴۰ بند، تحریر ۳ ذی قعدہ ۱۲۸۰ھ روز دوشنبہ

کاتب الحروف کاظم علی قصبہ پانی پت

انیس کا تاریخی ماحول اور شخصیت کا ابھار

موسم بہار میں بہت سے خودرو پودے اُگ آتے ہیں اور بہار کے رخصت ہوتے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ میدانوں کا سبزہ اور جنگلوں کے جھاڑ جھنکاڑ موسم کی پیداوار ہیں۔ بہار آئی، قوت نامیہ نے اپنے سینے کی تمام طاقت باہر نکال دی اور کف دست میدان، خوش نما گلستان بن گئے ؎ موسم ختم ہوا اور ہری بھری زمین بیابان ہو گئی۔ اِسی بہار میں جنگلی گھاس اور خودرو پودوں میں کبھی کبھی آم کا درخت، شیشم کا پودا، اور برگد کا پیڑ بھی سر نکالتا ہے اور سردی، گرمی، آندھی، طوفان، دھوپ اور لو سے مقابلہ کرتا۔ جان بچاتا، بڑھتا اور پھلتا رہتا ہے۔ آخر ایک دن اس کے سائے میں شوقین لوگ بیٹھ کر آم کھاتے ہیں۔ کبھی مسافر دم لیتے ہیں۔ کسی کی برات اترتی ہے۔ حالانکہ آم، شیشم اور برگد کے تینوں پودے موسم کی اکیلی پیداوار نہ تھے سینکڑوں بیج اکھوا بنے، گھورے پنیریاں، اور پنیریاں پودوں اور درختوں کی شکل میں بدل کر مرجھا گئیں ہرے بھرے کھیت سپاٹ زمین سے سر اٹھاتے ہیں۔ فضا میں جھومتے اور بالیاں لاتے خوشے دبتے اور سوکھتے اور بالآخر بھوسا بن جاتے ہیں۔ ادب میں افراد و شخصیات کی یہی حالت ہوتی ہے۔ تمدن اور معاشرہ اسی طرح پیدا ہوتا، بڑھتا، پھلتا پھولتا اور اپنی عمر طبعی تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اچھی زمین، اچھے حالات، اچھے عوامل میں پیدا ہونے والی قوم اپنی یادگار کے لیے کوئی اہم بات، کوئی محیر العقول کارنامہ کوئی لاجواب شخصیت اور بے مثال تخلیق چھوڑ جاتی ہے۔ بعد

میں آنے والے اس یادگار کو امروز و فردا کے پیمانوں سے ناپنے،
فکر و فن کی نظر سے دیکھنے اور تاریخ و تنقید کی کسوٹی پر کس کے نتائج
نکال جاتے ہیں۔ اس سے پرانی قوم کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے، پرانی
تاریخ کی افادیت سمجھ میں آتی ہے اور نئی قوم میراث حاصل کرتی
ہے اور نئی روایت بھی استوار کرتی ہے اور قدآوری کے اصول و
نتائج کی روشنی میں خود بڑھنے اور پھیلنے کی سعی بھی بجالاتی ہے۔
شخصیت کے پنپنے میں صرف تاریخ ہی کوئی بڑا عامل نہیں ہے
لیکن ہوا کی طرح اسے بنیادی درجہ ضرور حاصل ہے، شخصیت کے لئے
تمدن اور ماحول زمین کا درجہ رکھتا ہے۔ فکر اور قوتِ فن
کی انفرادیت پانی کے مانند ہے۔ علامہ اقبال، مولانا حالی، محمد حسین
آزاد اور انیس و دبیر کے زمانوں میں بہت سے مفکر، شاعر، ادیب
اور فن کار گذرے ہیں مگر گیہوں کے کھیت اور انگور کے تاکستان
پیدا ہوئے، رعنائی دکھائی، پھل دیے اور ختم ہو گئے۔ گیہوں کے
کھیت میں شیشم کے درخت اور انگور کی بیلوں کے نیچے برگد کی
پنیری بھی تو نکل سکتی ہے۔ کھیت کٹ جانے اور بیلوں کے سوکھ
جانے کے بعد خود رو پودے تناور درخت بن کر چھا جاتے ہیں
یونہی عظیم شخصیت بڑھتی پھیلتی اور سب پر چھا جاتی ہے۔

میر انیس تیرھویں صدی ہجری، اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز
میں پیدا ہوئے اس وقت ان کا خاندان فیض آباد میں تھا۔ فیض آباد
مغل دربار کے آخری بہادر سپہ سالار اور صوبہ دار نواب شجاع الدولہ
بہادر نے آباد کیا تھا نواب برہان الملک سعادت خاں، نواب صفدر
جنگ اور شجاع الدولہ نے اپنے بازوؤں کے سہارے، خلوص کے
ہاتھوں دہلی کی وہ خدمت کی جس سے قلعۂ دہلی کے تاج و تخت کو مزید

سو برس تک بادشاہ ملتے رہے۔ یہ بہادر جنگ آزما دہلی سے لڑتے ہوئے
لکھنؤ تک آئے۔ اور پورب کے وسیع الذیل، زرخیز اور بڑی آمدنی کے
صوبے میں گورنر یا نواب وزیر مقرر ہوئے "آگرہ و اودھ" کے سرکش
زمینداروں، باغی امیروں کو رام کرنا ایک پیچیدہ کام تھا جس کی تفصیل کا
یہ موقع نہیں۔ نواب برہان الملک (۱۱۳۴ھ — ۱۷۲۲ء سے ۱۱۵۱ھ
۱۷۳۹ء اور نواب ابوالمنصور صفدر جنگ (۱۱۵۱ھ ۱۷۳۹ء تا ۱۱۶۷ھ
۱۷۵۴ء) مسلسل معرکہ آرا رہے اور ان کے جانشین نواب شجاع الدولہ
نے متعدد میدان سر کرنے کے بعد تقریباً پوری قلمرو اودھ میں امن
وامان وضبط ونظم بحال کر دیا۔ ان کے بیٹے نواب آصف الدولہ بھی
نوجوانی سے حکمرانی تک دشمنوں، باغیوں اور حریفوں سے نبرد آزما
رہے۔ اس کے نتیجے میں فیض آباد، سپاہیانہ روش کے عوام، مملکت
کی مرکزی چھاؤنی اور چاق وچوبند فوجی افسروں کا شاندار شہر
بن گیا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ نوابین اودھ ابتدا ہی سے اعلیٰ
خاندان اور مہذب گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی
ریاست کے طور طریقے عام ریاستوں سے مختلف تھے۔ وہ
لٹیرے نہیں تھے کہ خانہ بدوش قبائل کی طرح لوگوں کو لیے پھرتے
وہ خونخوار وحشی سردار نہ تھے۔ کہ لوٹ مار کر کے اپنی دھاک بٹھاتے
اور فاتح کہلاتے۔ وہ لوگ صاحبانِ سیف اور اربابِ ذوق
تھے۔ شجاع الدولہ، دہلی سے فیض آباد منتقل ہوئے تو شاہ جہاں آباد
کے اربابِ نشاط سے لے کر صاحبان خرقہ وسجادہ، اور سپاہیوں
سے لے کر شاعروں تک سب کے قافلوں کا رخ موڑ دیا۔ دہلی سے
فیض آباد تک وہ چہل پہل، رونق اور آبادی تھی جیسے نئی دنیا بس
گئی ہو۔

دہلی لٹ چکی تھی۔ شاہ دہلی شہنشاہ اکبر و صاحب قرآن شاہ جہاں کے تخت پر بطور تبرک کے بیٹھتا تھا، اس کا بیشتر وقت اربابِ طرب کی نذر تھا۔ ارباب ہنر بے روزگار، صاحبانِ فن قدردانوں سے محروم تھے۔ لہٰذا سخت وضعدار اور کاہل و ناکارہ لوگ وطن کی خاک پر دھونی رمائے اور آسن جمائے بیٹھے ۔اور شاہ جہاں آباد کے فاقے آبرو کے نام پر جھیلتے رہے۔ جوان ہمت اور ترقی پسند فیض آباد آئے اور سخاوت و قدردانی کے دھواں دھار بادلوں سے نہال ہو گئے، نئے شہر نے جہاں دہلی کے پرانوں کو صدر میں جگہ دی وہاں نوجوانوں کو دوڑنے اور بڑھنے کے میدان بھی دیئے

ایک طرف سپاہی اور سپاہی زادوں کو جاہ و جلال ملا۔ دوسری طرف اربابِ علم و کمال کو عزت و دولت حاصل ہوئی۔ میر، سودا خان آرزو، میر قمر الدین منت، میر ضاحک اور میر سوز۔ صاحبانِ کمال ادب کے سرخیل تھے۔ ان کے آنے سے ادب کی روایت نئے شہر میں منتقل ہوئی اور تاریخ فن کی داغ بیل پڑی۔ شجاع الدولہ عموماً سپاہی اور انتظامی جنگی اور ریاستی معاملات کے لیے دار الحکومت کے باہر رہتے تھے۔ دار الحکومت میں نواب بہو بیگم کی ڈیوڑھی امرا و شعرا اور علما سے آباد تھی

فیض آباد کی زندگی واضح طور پر دو رنگوں سے رنگی ہوئی تھی۔ شجاعت و سپاہیانہ فضا اور فنونِ لطیفہ کا رچاؤ۔ تہذیب و آداب امارت نے ایک طرف شعر و ادب کی حس تیز کر دی تھی دوسری طرف تیر و تلوار نے مزاجوں میں تیزی اور تیکھا پن پیدا کر دیا تھا۔ میر تقی میر اور آتش جیسے متعدد حضرات سپاہی بھی تھے۔ اور شاعر بھی اور رنگین و ناسخ جیسے شاعر تجارت بھی کرتے تھے۔ اس ماحول میں سب سے

بڑا انفیاتی تاثر باہمی مقابلہ، دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ اور ہمہ جہتی مسابقت کا اظہار۔ قوت و بہادری میں بانکپن شعر و شاعری میں توشیح اور نفاست تھی۔ امیر و وزیر دریا دل تھے۔ لہٰذا سپاہی جان نثار اور شاعر و دبیر کوس لمن الملک بجا رہے تھے۔

ہارون رشید و مامون رشید کے دربار میں ابو نواس، بشار بن برد دعبل اور ابن الرومی۔ سیف الدولہ کے یہاں متنبی کا وجود۔ اکبر و جہانگیر کے عہد میں، فیضی ابو طالب کلیم، فیضی، نظیری، ظہوری جیسے اکابر شعرا کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ میدان میں تھک کر گھر آنے والا سپاہی کس قسم کے اذکار و نغمات سے متلذذ ہونا چاہتا ہے۔ بدیع الزمان ہمدانی، ابو القاسم حریری، عباسیوں کے عہد میں المقامات۔ تاریخ وصاف۔ درۂ نادرہ۔ فتح مندیوں کے دورِ شباب کی یادگار ہیں۔ مکاتیب ابو الفضل سہ نثر ظہوری، وقائع نعمت خاں عالی ہمارے برصغیر میں ادب کے مختلف مظاہر ہیں۔ خود اورنگ زیب پوری زندگی شمشیر بکف رہتا ہے لیکن اس کے اسی ہاتھ میں قلم آتا ہے۔ تو گلستان کی نزاکت و لطافت کے پھول کھلنے لگتے ہیں۔ اسی طرح فیض آباد میں جس تاریخ و ثقافت نے جنم لیا وہ سرخ و سفید تھی۔ قسمت آزما تلو ریوں کی شاندار فتوحات کی بنا پر سرخ اور مسرت خیز ثقافتی تقریبات و اجتماعات کی وجہ سے سفید۔ جیسے گلاب کا پودا جس کی شاخوں میں کانٹے اور درشتی لیکن گل پر لطافت اور رنگینی، فیض آباد میں یہ رنگا رنگی اس لئے نکھر گئی تھی کہ دہلی کے اربابِ کمال و جمال کی منتخب جماعت نے نقل مکان کیا تھا۔ ۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۵ء میں آصف الدولہ، اودھ کے فرماں روا ہوئے انہوں نے اقتدار کا مرکز ثقل فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کر لیا تو فیض آباد کا جوہر قابل لکھنؤ سمٹ آیا۔ خوش قسمتی سے آصف الدولہ کی

صورت، سیرت، طور طریقے، اکبری دور کے خان خاناں، عبدالرحیم جیسے تھے۔ میدانِ جنگ میں کڑی کمان کا تیر، مسند بزم اور مجمع احباب میں شاخِ ثمردار۔ عوام انہیں آن داتا، غریب انہیں گنج بخش، اہل ہنر قدردان سمجھتے تھے۔ جذبہ ہے کہ دوکانداروں کو "آصف الدولہ دلی" کہہ کر دکان کھولتے تو ہم نے بھی دیکھا تھا۔ سو برس کی کہاوت بھی سنا کرتے تھے۔ جس کو نہ دے مولا، اس کو دے آصف الدولہ بقول پروفیسر مسعود حسن ادیب "میر کی نازک مزاجی اور بے دماغی ان کے گستاخانہ اقوال و افعال کو آصف الدولہ جس طرح برداشت کرتے رہے، اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے میر کے کمالِ شاعری کی اتنی قدر کی جس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتی" (تذکرہ ذاکر) میر سوز کے بارے میں قدرت اللہ شوق کا بیان ہے :-

"محمد میر سوز، سید صحیح النسب، ساکن شاہجہاں آباد، جوان قابل، تیر انداز، خوش نویس، ہفت قلم، انشا پردازی میں کامل مہارت رکھتے ہیں۔ بڑے نازک طبع نکتہ سنج، عجیب و غریب آدمی ہیں، ایک علاحدہ طرز کے موجد ہیں۔ شعر ایسے نادر انداز سے پڑھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں، آنکھیں۔ بلکہ تمام اعضاء حرکت میں آجاتے ہیں۔ خلیق و بامزہ آدمی ہیں"

حکیم احد علی یکتا کے بقول حکیم انشاء اللہ خاں، رضا قلی آشفتہ، نوازش حسین خان مرزا خانی نے سوز کا انداز بڑی حد تک اپنایا ہے۔ یاد رہے کہ "انداز داد، بامزہ و نمکینی خوش تقریری و خوش طبعی و ظرافت، آداب دانی ملوک و سلاطین) دستور الفصاحت، کے ساتھ ساتھ وہ پیر بھی تھے۔ اور سرفراز الدولہ نائب وزیراں کے معتقد و مرید تھے۔

لکھنؤ کو آصف الدولہ نے از سر نو آباد کیا تو اسے رشکِ بغداد

وصفاہان ہجواب اکبرآباد و شاہ جہاں آباد بنا دیا۔ غلام علی نے عماد السعادت میں لکھا ہے۔

اس جناب کے فیض و احسان کے نتیجے میں لکھنو فضلاء شعرا، ہر طرح کے ارباب صنعت اور دانشور غرض کہ خوبانِ عالم کا ایسا مجمع ہوگیا کہ اِس ہیئت اِجتماعی کا کوئی شہر دنیا میں سنا نہیں گیا۔ راقم نے جنوب کے بڑے بڑے شہروں کو دیکھا ہے، کسی جگہ کو لکھنو کی طرح ارباب فضل و کمال کا معدن نہیں دیکھا۔ صرف ہندوستان والے ہی اِس جناب کی دولت کے فیض سے مستفیض نہ تھے۔ ایران کے معززین بھی جوق در جوق یہاں پہنچ کر ان کے خوان کرم سے شادکام تھے۔ درحقیقت ان کے احسان و کرم کی شہرت نے عراق کی دوری کو قربت سے بدل دیا تھا۔ ان کی سخاوت و ہمت نے سلاطین گذشتہ کے قصوں کو بے اصل فسانہ بنا دیا"۔

(شاہان اودھ کا علمی ذوق ص ۱۲)

حکومت اودھ کی تاریخی اور ثقافتی بحث میں یہ نکتہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے کہ حکمرانانِ عالم کی طرح ان فرماں رواؤں کے کچھ مخصوص فکری رجحانات بھی تھے۔ بنی امیہ نے عربیت و عداوت بنی ہاشم۔ بنی عباس نے عجمیت و فلسفہ اور تیموریوں نے تصوف کو رواج دیا۔ اودھ کے نوابین و سلاطین نے محبتِ خاندانِ رسالت کو کھل کر ظاہر کیا۔ یہ بات فیض آباد میں چاہے پوری طرح سامنے نہ آئی ہو مگر لکھنو میں واضح ہوگئی۔

آصف الدولہ نے جس طرح اپنے لئے شاندار "دولت خانہ" بنوایا اس سے زیادہ اہتمام کے ساتھ "امام باڑہ" بھی تعمیر کیا۔ جیسے اکبر نے فتح پور سیکری کی شاہی عمارتوں کے ساتھ ساتھ شیخ سلیم چشتی کے مزار پر بے دریغ روپیہ صرف کیا تھا۔ اور جس طرح ان درباروں میں قصیدہ غزل موسیقی و مصوری کو عروج ملا۔ اسی طرح سماع کی محفلوں اور

تصوف کی غزلوں اور مثنویوں کو بھی اعلیٰ مقام دیا گیا تھا - جہاں شاہ نامہ
پڑھا جاتا تھا۔ وہاں مثنوی معنوی بھی سنی جاتی تھی - اس عہد میں خیام و
حافظ نے نہ کسی کی ہمت پست کی نہ تصوف نے توکل کا سبق دے کر
توکل کے زانو سے اونٹ کو باندھا - دراصل قوم کے عروج میں نشیب و
فراز کی دھوپ چھاؤں فکر و عمل کے مختلف مظاہر بن کر فن کو جنم دیتی
ہے - اور قوم کے زوال میں یہی چیزیں دیمک بن کر ستونوں کو کھوکھلا
کر دیتی ہیں - قوم کا عروج و زوال سیاسی رہنماؤں اور حکمراں افراد
کی سوجھ بوجھ اور پوری قوم کے شعور بیدار کا نتیجہ ہوتا ہے - اور ادب
اس مجموعی حالت کا آئینہ -

میر انیس کا خاندان دہلی سے فیض آباد آیا تو شمشیر و سناں کے
طور طریقے توجا نتا تھا مگر ان کا فن بزم کی زندگی تھا - ضاحک
سودا، سوز اور رنگین و انشاء کی قسم کے آدمی تھے ان کی دوستی
صوفیوں سے بھی تھی اور خود سید مخترم تھے - شجاع الدولہ اور
بہو بیگم کی سرکار میں مصاحب و شاعر کی حیثیت سے ملازم بھی تھے - میر حسن
انتہائی نیک فطرت، خوش اخلاق، دیندار اور شاعر، فنون سپہ گری
کو اسی طرح جانتے تھے جیسے اس ماحول میں ہر شریف کو جاننا چاہیے
تھا - انہوں نے رزم کو دور سے اور بزم قریب سے دیکھا تھا - نواب
بہو بیگم کی سرکار اور آصف الدولہ کے دربار میں حاضری کا شرف
رکھتے تھے - فیض آباد کے پرسکون اور لکھنؤ کے ہنگامہ آرا معاشرے
کی حکایتیں گھر میں اور باپ دادا کی شاعری کے چرچے باہر سنتے
تھے - گھر کی زبان میں شیرینی و لطافت، روانی و سلاست مثنوی
کی وجہ سے مسلّم تھی - میر حسن شجاع الدولہ اور سالار جنگ و میاں جواہر
علی خاں کے فیض آباد اور نواب آصف الدولہ کے لکھنؤ میں ملاح

تھے۔ مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ اس لئے معاصرین ان کی عزت کرتے تھے۔ ورنہ مصحفی اور قدرت اللہ قاسم وغیرہ کوئی نہ کوئی بات اعتراضاً ضرور لکھتے۔

میر حسن کے بڑے فرزند میر احسن، بقول مصحفی "جوان خوش ظاہر، باعلم وحیا اُنیس سالہ نوعمر تھے۔ (تذکرہ ہندی گویاں) قاسم کے بقول خلیق نے میر احسن سے کسب علم وہنر کیا تھا۔ شیر علی، افسوس، میر احسن کو میاں داراب علی خاں ناظر کے وابستگان دولت سے بتاتے ہیں۔ خلق کی ایک منظوم کتاب "طب احسن" کے دیباچہ کی روشنی میں میر احسن علوم متداولہ میں فاضل اور طب کے ماہر تھے۔ مالی اعتبار سے وہ سفر عراق کی دستگاہ رکھتے تھے۔

میر حسن کے دوسرے فرزند خلیق اور میر محسن، نواب مرزا محمد تقی خاں ہوس (داماد نواب بہو بیگم صاحبہ) کے رفیق تھے۔ نواب ہوس اچھے شاعر اور غزل گو، مرثیہ نویس اور مثنوی نگار تھے۔ ان کی مثنوی لیلیٰ مجنوں بہت مشہور ہے۔ ناسخ و آتش نے ان کے دامنِ دولت سے بہت فیض پایا تھا۔ میر خلیق، احسن سے چھوٹے تھے۔ اور علم و فضل میں بھی کوئی بڑا درجہ نہیں رکھتے تھے۔ ہاں غزل گوئی میں شہرت اور مرثیہ نویسی میں بڑا مرتبہ حاصل تھا خلیق فیض آباد سے لکھنؤ آیا کرتے اور مجلس پڑھ کے چلے جاتے تھے۔ پھر راجہ ٹکیت رائے کے خاندان میں ان کے بچوں کے اتالیق ہو گئے تھے۔

وہ شروع ہی سے نیک مزاج، پرہیزگار اور صرف ادیب و شاعر آدمی تھے محرم ۱۲۰۱ھ میں جب ان کی عمر بیس سال سے کم تھی۔ میر حسن نے لکھنؤ میں رحلت کی محلہ مفتی گنج میں سپرد لحد ہوئے۔ اسی علاقہ میں ان کا مکان بھی تھا۔ ظاہر ہے کہ خلیق بھی اس مکان میں آتے جاتے رہتے سہتے ہوں گے

اور نواب محمد تقی ہوس کے خاندان کی موجودہ سکونت بتاتی ہے کہ حسن و خلیق اسی آبادی کے کوچہ و بازار میں شہرت کی راہوں سے گذرے۔ ایک روایت یہ بھی سنی اور مستند حضرات نے تصدیق کی کہ میر خلیق محلہ سٹہ ہٹی میں رہتے تھے۔ یہ پہلے ۱۸۵۷ء کے غدر میں پھر آغا میر کی ڈیوڑھی پر اسٹیشن بنتے وقت تباہ ہو گیا۔ یہ وہی محلہ ہے جس کے قبرستان میں میر تقی میر کی قبر بتائی جاتی ہے۔ اب صرف قبرستان کے آثار پائے جاتے ہیں

میر حسن محرم ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء میں فوت ہوئے۔ ۱۲۱۲ھ کو ۱۷۹۷ء میں آصف الدولہ نے انتقال کیا۔ ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۴-۱۸۰۵ء میں انیس پیدا ہوئے۔ ان کی عمر ابھی گیارہ بارہ سال ہوگی۔ جو نواب امۃ الزہرا بہو بیگم صاحبہ نے ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۵ء میں رحلت فرمائی۔ ان کے بعد فیض آباد کی سرکار ختم ہو گئی۔ نواب سعادت علی خاں ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں دنیا سے سدھار چکے تھے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد نواب قاسم علی خاں بن نواب سالار جنگ نے انتقال کیا۔ لکھنؤ میں اس وقت غازی الدین حیدر جلوہ افروز تخت تھے تخت نشینی کے پانچ چھ برس بعد ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۹ء میں انہیں بادشاہ کا خطاب ملا۔ اس الٹ پلٹ میں ایک خاص بات یہ ہوئی کہ نواب بہو بیگم کی رحلت کے بعد ان کے خزانے کا جائزہ لینے کے لئے جو عملہ معین ہوا۔ اس میں مرزا پناہ علی افسردہ نواب اصغر علی خاں اور مرزا حسین علی خاں بن نواب قاسم علیخاں کی سفارش سے ڈیوڑھی کے داروغہ مقرر ہو گئے (تاریخ اودھ، نجم الغنی ج ۳ ص ۲۷)۔ افسردہ کے انتقال کے بعد داروغگی کسی اور کو مل گئی۔ ہمیں تاریخ کے اس عہد میں خلیق و احسن کا نام نہیں ملتا۔ گویا اس خاندان کا سیاست و ریاست سے کسی قسم کا رابطہ نہ تھا۔

میر انیس نے جس ماحول میں ہوش سنبھالا اس کا جائزہ لینے سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ شعر و شاعری اخلاق و آداب، سپاہیانہ فنون،

مروجہ علوم سے فیض آباد ہی میں باخبر ہو چکے تھے۔ ان کے زمانے میں دس بارہ مشہور مرثیہ گو تھے۔ جو عزت و ناموری و خوشحالی سے گذر کر رہے تھے۔ خلیق، دلگیر، ضمیر، فصیح، مسکین، افسردہ، سکندر، گدا، احسان اور ان کے دادا کی مثنوی اور والد کے مرثیوں کی دھوم تھی۔ ان کے ہم عمر فیض آباد و لکھنؤ میں مشق سخن کر رہے تھے۔ خاندانی طور پر وہ مذہبی آدمی تھے۔ باپ اور بھائی مقدس اور مرثیہ گو تھے۔ دوستوں اور استادوں نے ہمت افزائی کی، طبیعت نے شہ پائی اور بقول سعادت خان ناصر:

"عہد شباب میں کہ جب فیض آباد میں تھے۔ اوائل میں چند غزلیں بھی کہی تھیں جب سے لکھنؤ میں تشریف لائے، شوق مرثیہ گوئی کا ہوا۔ وہ سب غزلیں یک قلم دھو ڈالیں نسیاً منسیا۔ فی الحق مرثیہ ایسا کہا اور پڑھا کہ چرچا دور دور ہوا اور مرثیہ ان کا عام فہم و عام پسند ہوا۔ الغرض مرثیہ پڑھنے و بنانے میں ید طولانی حاصل کیا۔"

(تذکرہ خوش معرکۂ زیبا ص ۳۹۹)

میرا خیال ہے کہ انیس کے جوہر کمال لکھنؤ ہی میں ابھرے، نکھرے اور لعل شب چراغ بنے۔ ان کے فن نے فیض آباد میں سر اٹھایا لکھنؤ میں بڑھا پھیلا اور بارآور ہوا۔ انہیں لکھنؤ میں حریفوں کے مقابلے کے لئے عجیب فضا حاصل ہوئی۔

۱۲۴۰ھ کے بعد فسانۂ عجائب تیار ہو کر اشاعت کی متعدد منزلوں سے گذرا۔ لیکن اس میں دس مرثیہ گو شاعروں کے ساتھ گیا ہوا ان نام انیس کا نہیں ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ انیس کے معاصر مرزا دبیر بیس پچیس برس کی عمر میں ناموری حاصل کر کے مرثیہ گویوں کی صف میں اونچا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ میر انیس یا تو لکھنؤ میں مشہور ہوئے تھے یا ابھی وہ ابتدائی مراحل طے کر رہے تھے میر افضل حسین ثابت کہتے ہیں

کہ میر صاحب ۱۲۵۸ھ میں لکھنؤ آئے۔ یعنی نصیر الدین حیدر کے آخری اور محمد علی شاہ کے ابتدائی زمانے میں وہ یہاں پہنچے۔ (خمخانہ جاوید ج ص ۱۵۶)
حقیقت امر یہ ہے کہ جب تک میر خلیق زندہ رہے، انیس تحت الشعاع میں تھے۔ ۱۲۶۰ھ میں خلیق نے وفات پائی تو انیس کا آفتاب شہرت افق پر ابھرا۔ انیس اب تک کسی کے حریف نہ تھے۔ یوں تو انہوں نے میدان مرثیہ گوئی میں اس وقت قدم رکھا جب ایک طرف مرثیہ کی مخصوص روایت پختہ ہو چکی تھی، دوسری طرف وہ تجربہ کی منزلوں سے گذر چکے تھے۔ سامعین کا ذوق متعین تھا۔ ان کے والد کا اسلوب اور ضمیر و دلگیر و دبیر کا رنگ سامنے تھا۔ اب جو میر صاحب علم و فن، اخلاق و طبیعت فکر و نظر کی بلندیوں پر پہنچ کر طبع آزما ہوئے تو ایک عالم انگشت بدنداں ہو گیا۔ ان کے عہد کے نامور ایک ایک کر کے اپنے کمالات ہنر پیش کر کے اٹھتے گئے۔ اور منبر پر صرف ایک دو نام رہ گئے جن میں انیس کی شخصیت اور فن یوں چھایا ہوا ہے۔ جیسے سدا بہار چھتنار درخت بار دیا گلدستہ ہزار رنگ جسے خزاں کا ہاتھ نہیں چھو سکتا۔ فضا میں گونج ہے اور صدا آ رہی ہے۔

نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری — ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگین ہے عبارت میری — شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری
عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں — پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں
ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کر دوں — بحر امواج فصاحت کا تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں، ذروں کو انجم کر دوں — گنگ کو ماہر انداز تکلم کر دوں
درد سر ہوتا ہے بے رنگ نہ فریاد کریں — بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

خاندانِ انیس کی ادبی خدمتیں

انیس کے حیاتِ جاوداں کی پہلی صدی مکمل ہوگئی۔ دسمبر ۱۸۷۴ء سے پہلے انیس پر گفتگو انیس کی شخصیت کے پیشِ نظر ہوتی تھیں ۱۸۷۵ء سے موضوع بدل گیا۔ اب شخصیت فن کے پردے میں ہے۔ پہلے شخصیت سامنے تھی، اب فن سامنے ہے۔ پہلے فنکار بولتا تھا۔ اب فن بول رہا ہے سو برس پہلے انیس منبر پر آتے تھے۔ تو گویا؎

"کھلتا تھا پھول جیسے چمن میں گلاب کا"

اور آج انیس کا ادب چمن در چمن پھولوں کا سدا بہار گلدستہ ہے۔ ۲ر فروری ۱۸۷۵ء کے "اودھ اخبار" لکھنؤ نے یادِ انیس میں منعقد ہونے والی پہلی مجلس کا آنکھوں دیکھا مختصر حال یوں لکھا ہے:

"اللہ اللہ افصح الفصحا تاج الشعراء سلطان الذاکرین جناب میر ببر علی انیس کا چہلم بھی ہوگیا۔ یہ مجلس بھی قابلِ دید ہوئی تھی۔ علاوہ روساء لکھنؤ کے ہزارہا آدمی اس شہر کے اور بیسیوں باہر کے شریک جلسۂ تعزیت تھے جس وقت میر خورشید علی صاحب نفیس فرزندِ اکبر حضرت انیس مغفور نے مندرجۂ ذیل رباعی جناب میر ورکی پڑھی۔ اس وقت گریہ و بکا کا شور عالم بالا تک پہنچا تھا۔ ہر شخص مصروفِ نالہ و بکا تھا۔

دردا کہ فراقِ روح و تن ہی ہوگا   تنہا تنِ ناتواں کفن میں ہوگا۔
اس وقت کریں گے یاد رونے والے   جس دن نہ انیس انجمن میں ہوگا

اس مضمون سے حضرت انیس کی تصویر سب کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی تھی۔" اور اس وقت سے اب تک "انیس کی تصویر سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس کا سبب انیس کی ذات و صفات نہیں بلکہ وہ فن

ہے۔ جسے ان کے قلم نے پیدا کیا۔ اس کی وجہ انیس کا وہ ادب ہے جس نے زبان کو توانائی اور تاریخ کو رعنائی بخشی، بلاشبہ اگر انیس کا تخلیق کردہ ادب نہ ہوتا تو مشرقی زبانوں میں ایک خلا رہ جاتا۔

یوں تو انیس خاندانی طور پر ادب کے معمار ہیں۔ ان کے آباد اجداد نے مختلف اصناف سخن میں بہت بڑی بڑی خدمتیں انجام دی ہیں۔ ان کے گھرانے نے اردو ادب کی محبوب غزل کو کئی دیوان عطا کئے ان کے دادا نے "بدر منیر" جیسی بے مثال مثنوی سے ادب کے پلے کو گرانی بخشی ان کے والد نے مرثیہ کی خدمت کی لیکن حق یہ ہے کہ

کسی نے تیری طرح سے اے انیس
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

زیبائش و حسن کا معیار جو بھی قرار دیا جائے اردو ادب میں صرف ایک اکیلا ادیب انیس ہی ہے جو ہر معیار پر حسین ترین ادب کا خالق نظر آتا ہے۔

انیس نے ادبی جمود کی اس مضبوط روایت کو توڑا جسے قصیدہ و غزل نے جنم دیا تھا۔ ہیئت اور مواد دونوں میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کیا۔ لیکن لطف یہ ہے کہ پرانے مزاج جبیں بہ جبیں نہ ہوئے۔ ہماری شعری تحریک میں متعدد اساتذہ نے متروکات و لوازم پر مشتمل منشور بنائے۔ ہر مفکر ادیب نے نئے ادب کے لئے ضابطے معین کیے۔ پرانوں سے ٹکر لی۔ نوجوانوں کو نئی راہوں پر لانے کے لئے نعرے لگائے۔ مگر انیس نے کسی فنی یا فکری تحریک کا اعلان کیے بغیر ادب کا ایسا ڈول ڈالا کہ جس نے سنا وہ گرویدہ اور جس نے پڑھا وہ شیدا ہو گیا۔

مرثیہ کا موضوع جذبہ ہے۔ مرثیے میں عقیدے اور مذہب کی بات ہے۔ مرثیہ تہذیبی ماحول اور مخصوص ثقافتی عوامل کی پیداوار ہے۔

قطب شاہ سے لے کر سودا، میر، افسردہ، گدا، مسکین، ضمیر و خلیق تک ہر دور میں پانچ دس یا پچیس تیس شاعر مرثیہ لکھتے رہے۔ ہر شخص اپنے دور کا مشہور اور نامور یا شاعر تھا۔ ہر شخص کا کلام کوئی نہ کوئی گروہ ضرور پسند کرتا تھا۔ لیکن انیس نے مرثیہ کو آفاقیت بخشی۔ انیس نے مرثیہ کو پائیدار قوت بخشی، انیس نے مرثیہ کے ذریعہ اردو کو پنپنے اور بڑھنے کی ناقابل بیان طاقت عطا کی۔ مثنوی، چو مصرع، مستزاد اور مسلسل قطعہ کی ہیئتیں اردو میں رائج تھیں۔ خود ان کے دادا اور والد اس سلسلہ میں بہت کامیاب تجربے کر چکے تھے۔ انیس جیسے طبیعت دار ادیب کے لئے ان میں سے کسی ایک ہیئت پر قلم فرسائی دشوار نہ تھی۔ لیکن انہوں نے مسدس کو اپنایا۔ بلاشبہ میر ضمیر اِس انتخاب کے لئے نمایاں اولیت رکھتے ہیں۔ لیکن انیس و دبیر نے مسدس کا انتخاب اجتہادی شعور کے ساتھ کیا۔ اِن بزرگوں کی محنت اور خلوص فن کا نتیجہ ہے کہ یہ ہیئت اچھے شعر و فکر کے لئے زرخیز اور دلکش زمین کا فائدہ دے رہی ہے۔ آل رضا اور جوش تک اقرار کرتے ہیں کہ مسدس ہیئت سے بہتر کوئی ہیئت نہیں۔ درحقیقت انیس نے پھر ان کے خاندان نے اور ان کے ساتھ ان کے معاصرین نے اِس ہیئت پر اتنے تجربے کئے، اسے اتنے پہلو دیئے۔ کہ اب ہر راہی آنکھ بند کر کے اس راستے پر چلے یا سوچ بچار کے بعد، اسے منزل بہر حال نظر آجاتی ہے۔ حالی، اقبال، چکبست، اور جوش کے جدید سے جدید تر تجربوں کا نتیجہ بھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔

انیس کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے درد اور خالص اظہار کرب کے لئے مخصوص فن و موضوع کو سمندر کا پھیلاؤ۔ دریا کا بہاؤ، بہار کی رعنائی نبض کی حرکت اور دل کی دھڑکن بنا دیا۔ انسانی جذبات کے تہہ در تہہ تضاد در تضاد مظاہر در مظاہر کو مجسم کیا۔ محبت و نفرت، زندگی اور موت

بقا و فنا، عزت و ذلت جنگ اور صلح، فتح اور شکست، رحم و ظلم، رونا اور ہنسا، فکر و عمل، پیام و فلسفہ، زبان اور خیال، حکایت اور تمثیل کو اس وسیع پیمانے پر مرثیہ میں منتقل کیا۔ جس کی مثال انیس سے پہلے کہیں نہیں ملتی - پھر جذباتی و عقیدتمندانہ خیال، معاشرتی تقاضوں کا شعور، روایتی اخلاق و آداب کا لحاظ بھی کمال قدرت کے ساتھ ملحوظ رکھا ہے - اور موضوع کو بھی ابھارا ہے - واقعہ کربلا کی المناک ترجمانی دیکھیئے اور باغ و بہار کی نازکی، قصیدہ و غزل کا نکھار، مدح و ہجو کا معاملہ، مسرت اور غم کا میل، بہار، صبح، شام، ساقی نامہ، تلوار، گھوڑا، جنگ، سراپا، رجز اور فتح کے بعد، شہادت پھر بین کچھ اس طرح بہ ترتیب بات کہی ہے کہ نہ طبع کو گرانی محسوس ہوتی ہے - نہ ذوق بے لطفی کا تصور کرتا ہے، واہ کے ساتھ آنسو بھی رواں رہتے ہیں -

آپ صرف انیس و نفیس و عروج و فائز یا عارف و فائق اور قدیم کے مرثیہ گو جیسے مونس، انس، سلیس، رشید اور ان کے معاصرین کے کلام کا مطالعہ کیجئے تو حیران رہ جائیں گے ڈیڑھ ڈیڑھ سو بند ہیں - اور سو سو طرح کے نفسیاتی و ادبی گوشے ہیں مگر نہ خیال الجھتا ہے نہ موضوع بدلتا ہے - بہادر جنہیں قصیدہ، رجز میں حریف کی ہجو، جنگ میں خالص رزم تلوار اور گھوڑے میں غزل کے ہلکے ہلکے رنگ ملتے جائیں گے - لیکن انتہائے کیف میں بھی شدت الم آفرینی کا عالم وہی ہے "تلوار کی تعریف کرتے کرتے آواز دی جاتی ہے -

سحاب بن کے برستی ہے تیغ، ہاں ساقی!
تلاش تجھ کو کیا ہے - کہاں کہاں ساقی!
جو طاق کعبہ پہ ہو جام دلستاں ساقی!
لگالے دوش محمدؐ کی نردباں ساقی!

جلا کے کفر کی بستی کو خاک کرتا آ!
خدا کے گھر کو بتوں سے بھی پاک کرتا آ!

پلا دے آج مجھے ساقیا تو اتنی شراب
کہ اُبلے میرے مسامات جسم سے مئے ناب
دکھا دے مشکل اجازت جو دے غرور شباب
مریض ہجر کی حالت بہت ہوئی ہے خراب

اب اِس قدر نہ غمِ انتظار دے ساقی!
یہ ڈوبتی ہوئی نبضیں ابھار دے ساقی!

ہو لطف قند مکرر جو دے دوبارہ جام؛
سوا ہو زور قلم دے اگر سہ بارا جام
ابھی سے روک لیا ہاتھ دے کے گیارہ جام؟
اک اور ہے تیرے ذمے ابھی ہمارا جام

وہ لیں گے جبکہ جب آئے گا بارہواں ساقی!
امام مہدی دین ع، آخر الزمانی ساقی!

لگا نہ دیر بہت وقت یہ مدد کا ہے
کہ مارے پیاس کے اب دم لبوں پہ آیا ہے
خیام شاہ میں شور العطش کا برپا ہے
ترا پسر پیئے تدبیر آب نکلا ہے

نہ دے مجھے نہ کروں گا میں رشک اے ساقی!
یہ شوق بھر دے سکینہؑ کی مشک اے ساقی!

یہ بند انیس کے نہیں بلکہ ان کے پوتے علی نواب صاحب قدیم (فرزند سلیس) کی تصنیف ہیں۔ خود انیس نے متعدد مقامات پر اس قسم کے کمالات کا مظاہرہ کیا ہے۔ مثلاً مشہور مرثیے "جب قطع کی مسافت شب

آفتاب۔ نے" ۔ میں صبح کا منظر بیان کرتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں۔

وہ دشت، وہ نسیم کے جھونکے، وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جابجا وہ گہرہائے آب دار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل، تو گل ہزار
خواہاں تھے زہرِ گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

بائیسواں بند ہے:

ناگاہ چرخ پر خطِ ابیض ہوا عیاں   تشریف جانماز پہ لائے شہِ زماں
سجادے بچھ گئے عقبِ شاہِ انس و جاں   صوتِ حسن سے اکبرؑ مہرو نے دی اذاں
ہر اک کی چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی
گویا صدا رسولؐ کی کانوں میں آ گئی

چپ تھے طیور جھومتے تھے وجد میں شجر   تسبیح خواں تھے برگ و گل و غنچہ و ثمر
محوِ ثنا، کلوخ و نباتات و دشت و در   پانی سے منہ نکالے تھے دریا کے جانور
اعجاز تھا کہ دلبرِ شبیر کی صدا
ہر سنگ و شجر سے آتی تھی تکبیر کی صدا

ناموسِ شاہ روتے تھے خیمے میں زار زار   چپکی کھڑی تھی صحن میں بانوئے نامدار
زینب بلائیں لے کے یہ کہتی تھی بار بار   صدقے نمازیوں کے مؤذن کے میں نثار
کرتے ہیں یوں ثنا و صفت ذوالجلال کی
لوگو! اذاں سنو میرے یوسف جمال کی

یہ حسنِ صورت، اور یہ قرأت یہ شد و مد   حقا کہ افصح الفصحا ہے۔ انہیں کا جد
گویا ہے لحنِ حضرتِ داؤدِ با خرد   یارب رکھ اس صدا کو زمانے میں تا ابد
شعبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسولؐ میں

میری طرف سے کوئی بلائیں تو لینے جائے　　عین الکمال سے تجھے بچے خدا بچائے
وہ لو فزعی کہ جسکی طاقت دلوں کو جلائے　　دو دن میں ایک بوند بھی پانی کی وہ نہ پائے
غربت میں پڑ گئی ہے مصیبت حسینؑ پر
فاقہ یہ تیسرا ہے مرے نورِ عین پر

المیہ کا نیا روپ اور مرثیت کا یہ نکھرا ہوا اسلوب کسی زبان میں نہیں ملتا
ان لوگوں نے ادب کو اظہار و ابلاغ کے دِل کش پیرائے میں ہمیشہ مجمع کے مجموعی مزاج اور سنتے یا پڑھنے والوں کی عام سطح کو سامنے رکھا۔ نہ زبان کو اتنا بوجھل بنایا کہ بے پڑھے لکھے سمجھ نہ سکیں، نہ اتنا گرایا کہ پڑھے لکھے لوگوں کی نفاست ذوق پر گراں گزرے۔ حیرت کی بات ہے۔ اِن مرثیوں میں، دوست، دشمن ادنیٰ، اعلیٰ ہر قسم کے افراد سامنے آتے ہیں۔ اِن کے لہجے بدلتے ہیں۔ ان کی بات کا انداز ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتا ہے، مگر تاثیر میں ناہمواری نہیں آتی۔ سخت سے سخت موقع پر بھی بداخلاقی اور کرختگی نہیں دکھائی دیتی

خاندانِ انیس نے خلوص کے ساتھ مرثیہ کو اپنا فن بنایا۔ ان کی نسل مرثیہ خوانی و مرثیہ گوئی کے لئے وقف ہو گئی۔ مرثیہ پر ہر ایک نے ریاضت کی اور کم و بیش ڈیڑھ سو برس تک باپ کے بعد بیٹا اِسی راہ پر گامزن رہا آخر مرثیہ گوئی اعزازِ فن کا سبب بن گئی۔ اور مرثیہ ادب کی جامع الاصناف شاخ قرار پائی۔

انیس و نفیس نے سو سال تک مرثیہ پر جو محنت کی اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرثیہ ہماری زبان کا وسیع اور خوبصورت دفتر بن گیا۔ اور آج مرثیہ کا مطالعہ کئے بغیر ادب کا مطالعہ ناقص قرار دیا جاتا ہے۔ زبان کی وسعت بیان کے امکانات، ایک رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے اور ایک طرح کی بات ہزار رخوں سے کہنے کا فن صرف مرثیہ کے معیار پر پرکھا جاتا ہے۔

انیس کا دور زبان کی تراشش خراش کا دور تھا۔ شاہ حاتم، سراج الدین آرزو، سودا، دبیر نے "متروکات" کا دفتر کھول رکھا تھا۔ ناسخ، اسیر، رشک اور بحر جیسے نقاد روز ایک قانون بنا رہے تھے۔ لفظوں کی صورت، رنگین کی ہیئت پر پابندیاں تھیں یہ لکھو یہ نہ لکھو، یہ بولو یہ نہ بولو۔ ناسخ و ضمیر و دبیر جیسے اکابرِ فن کے مقابلے میں عام زبان، عام لہجے اور عام اسلوب کی طرف جھکنا آسان کام نہ تھا۔ پھر اس رجحان میں ضبط و اعتدال سے کام لینا بہت بڑی بات تھی۔ ورنہ نظیر کی طرح انیس اور ان کے بعد ان کے جانشینوں کے لئے خطرناک راستے کھلے ہوئے تھے وہ میلے ٹھیلے، جشن اور جلسوں کے لیے گری پڑی راہوں میں نکل جاتے تو کون روک سکتا تھا۔ "متروکات" اور محاورات کا پابند نہ ہونے کے بعد بھی ان کا کلام فصاحت و بلاغت لطافت و نفاست کا آئینہ خانہ ہے۔ انیس اور ان کے خاندان نے اردو ادب کو لفظوں کا بہت بڑا خزانہ دیا۔ انہوں نے بن گھڑے اور بے تراشے پتھروں کو نگینہ کا ڈھنگ اور جواہرات کا رنگ دیا۔

انیس نے مرثیہ کا جو ڈول ڈالا اس میں لہجوں کے تنوع اور کردار کے اختلاف سے تمثیل اور فطرت نگاری کا دروازہ کھولا۔ اب یہ کمالِ فن اور بالغ نظری ہے کہ مکالمے ہیں، منظر نگاریاں ہیں، کرداروں کے زمان و مکان ہیں لیکن ڈرامہ کے رنگ ڈھنگ نہیں ہیں۔ وہ مرثیہ کو خالص اسٹیج پر عملی صورت دینے کے نقصانات سے اسے بچا لے گئے۔ اب مرثیہ تمثیل تو ہے مگر ایکٹ اور اسٹیج کی چیز نہیں۔ اس میں اسلامی رکھ رکھاؤ اور اخلاقی معیار اور عقیدے کا احترام غالب ہے۔

انیس نے محسوس کیا تھا کہ ان کا کلام حرکت اور زندگی سے مالا مال ہے۔ اگر اسے لہجہ اور ادا نہ دی گئی تو فن میں یا تو جان نہ آئے گی یا کوئی چابکدست فنکار اسے دوسرے نہج پر ڈال دے گا۔ لہٰذا ان لوگوں نے

"ادا" کو بھی اپنایا۔ یہ اداکاری ڈرامے کی اداکاری سے بالکل جداگانہ چیز ہے اس میں مرثیہ خواں نہ غیر معمولی لباس پہنتا ہے نہ منبر کے کسی رُخ پر پردۂ رنگین ہوتا ہے۔ شاعر اپنے چہرے مہرے یا اعضا سے کوئی خلاف عادت عمل کر کے کسی غیر معمولی مظاہرے کا سبب بنتا ہے۔ ممبر پر بیٹھ کر آواز کے معمولی اور باوقار اُتار چڑھاؤ روانی اور وقفہ، کبھی ہاتھ اور آنکھ کے اشارے سے شعروں کی حرارت و تاثیر میں اضافہ کرتا ہے۔ اُچھل کود، لحن اور موسیقیت چہرے کا بناؤ یا بگاڑ، "ادا" کے آداب سے خارج قرار دے کر لطافت و وقار بھاری بھرکم پن اور اپنی شخصیت کے رکھ رکھاؤ کی پوری نگہداشت کے ساتھ چند اشارے، چند تیور اور چند معتدل اور نرم حرکات کو جذبات کے اظہار، مناظر کی نشاندہی اور کیفیات کو اثر انگیز کرنے کا ذریعہ قرار دیا لکھنؤ میں "دل آرام کی بارہ دری" میں ۲۵؍ رجب کو انیس پھر ان کے بیٹے اور پوتے مرثیہ تو تصنیف پڑھا کرتے تھے۔ اور میر باقر سوداگر کے امام باڑے میں مرزا صاحب کے خاندان والے زیبِ منبر ہوتے تھے۔ ہم نے چوہٹیوں کی مجلس میں محمد حسن صاحب فائز اور پارچے والی گلی میں محمد رفیع صاحب طاہر کو مدتوں سنا ہے مجلس میں شریک ہونے والے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ "پڑھنا خاندانِ انیس کا حصہ ہے۔ انیس مرحوم ایک ایک اشارے سے واقعہ یا خیال کی تصویر کھینچ دیتے تھے" نفیس مرحوم بھی اسی طرح پڑھتے تھے۔ دولہا صاحب عروج نے تو صرف پڑھنے ہی میں ناموری حاصل کی، وہ منبر پر شیر کی طرح گرجتے اور یوں پڑھتے تھے کہ جیسے انیس مرثیہ گوئی کے بادشاہ مان لئے گئے ! یونہی عروج اور ان کے فرزند فائز مرثیہ خوانی کے بادشاہ قرار پائے۔ ان کے بعد عارف مرحوم کے فرزند فائق صاحب بھی خوب پڑھتے رہے۔ اور فائق صاحب نے واقعاً اس فن کو عروج پر پہنچا دیا

۱۹۴۴ء میں فائق صاحب کی وفات پر لکھنؤ میں مرثیہ خوانی ختم ہو گئی۔

ایک بات یہ بھی یاد رہے کہ خلیق نے انیس کی پرورش کی۔۔ نفیس اور عروج نے اپنے والد کے ساتھ عمر کا بہت بڑا حصہ گذارا۔ اِس لئے پورے خاندان میں ایک ہی انداز، ایک ہی اسلوب اور ایک ہی طریقہ کے سب پابند رہے۔ خاندانِ انیس کی سب سے بڑی خدمت یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایک ہیئت اور ایک دستور پر پوری صدی محنت کی اور اسے ہر قسم کے زوال سے محفوظ رکھ کر نئی نسل کے حوالے کیا۔ کمالِ فن اور حسنِ قبول تو خدا داد بات ہے۔ ورنہ اِس خاندان میں مونس، نفیس، عارف، رشید اور سالس وحید، فائز و قدیم و فائق صاحب میں بعض بزرگوں نے بہترین مرثیے لکھے۔ خصوصاً مونس و نفیس کا کلام انیس کے دفتر میں ملا دیا جائے تو امتیاز مشکل ہے قدیم و فائق بلکہ ان سے پہلے بھی عام لوگ کہہ دیا کرتے تھے کہ میر صاحب کا مرثیہ اپنے نام سے پڑھ دیا۔ یعنی خاندانِ انیس کے اسلوب کو اِس طرح ملحوظ رکھا گیا کہ ہم نے ان لوگوں کی طبع زاد چیزوں پر انیس کی چھاپ نظر آتی ہے

خاندانِ انیس نے جو خدمتیں انجام دی ہیں ان کی فہرست طویل ہے جس میں سے دس بارہ بنیادی باتیں یہ ہیں

۱۔ مجلسِ عزا میں ہر طبقہ کے آدمیوں کو جمع کیا اور سامعین کو اسلامی اخلاق، کردار و واقعات سے متعارف کرایا۔ ان کے ذوق کو ابھارا۔ اور اردو زبان سے محبت کا پیام دیا

۲۔ مرثیہ میں اعلیٰ ادبی روایات کو سمویا۔ اردو کے تمام اصنافِ سخن سے مرثیہ کو گلدستۂ صد رنگ بنایا۔ چنانچہ ہمارے ادب میں مرثیہ ایسی مکمل چیز ہے کہ اسے بین الاقوامی ادب میں شریک ہونے کا حق ہے

۳- مرثیہ کو رزمیہ اور حماسی شاعری کا بلند ترین درجہ عطا کیا اردو ادب میں صرف مرثیے ہی قابل فخر اضافہ کا باعث ہوئے۔

۴- مشرقی ادب میں طویل اور یکساں تاثر کے المیہ کی طرح ڈالی اور اسے عروج پر پہنچایا۔

۵- مختلف لہجوں، رنگا رنگ جذبوں اور پھیلے ہوئے مناظر کو یوں سمیٹا کہ مرثیہ، منظر نگاری اور حقیقت بیانی کی مکمل مثال بن گیا۔ اور اس نے ہمارے ادب کو ایک نیا عنوان بخشا۔

۶- محاکات، منظر نگاری، اور عکاسی فطرت کے عناصر اس انداز سے یکجا کیے کہ مرثیہ تمثیلی ادب میں شمار کیا جانے لگا۔ اور نئے ادیب اسے شیکسپیر اور ملٹن کے معیار پر پرکھنے لگے۔

۷- زبان کی حد بندیوں کے دبستانی اصول اور ناسخ در شک کی پابندیوں کے بر خلاف توسیع زبان کے لئے الفاظ و ترکیبات کا ذخیرہ اور ادب کو معتد اں لطیف اور قیمتی سرمایہ دیا۔ کہتے ہیں کہ میر خلیق فیض آباد میں نواب بہو بیگم کے ہاں دفتر زبان کے عملے سے تعلق رکھتے تھے اور ان الفاظ و محاورات منضبط فرماتے تھے آج نواب بہو بیگم صاحبہ کا دفتر تو موجود نہیں لیکن اولاد خلیق کا ذخیرہ استعمال زبان سند کے لئے موجود ہے۔

۸- ابلاغ کی اہمیت اور لہجہ میں عمومیت کو بڑھایا۔ یعنی اپنے جذبے سے نکل کر دوسروں کے دل میں جھانکا اور سننے والوں سے یوں بات کی کہ آج تک ہر شخص داد دے رہا ہے۔

۹- ادب میں ایک مشکل مگر سود مند، کرداری، اخلاقی اور پیامی صنف کو پیدا کیا جس سے نئی نسل اور نئی صدی نے سب سے زیادہ فیض پایا

۱۰- انیس و خاندانِ انیس نے رزم و بزم، مدح اور بین، غرض مختلف النوع معاملات و جذبات کو ادا کرنے کے لئے پڑھنے کا فن ایجاد کیا- اور یہ پڑھنا اِسی خاندان سے شروع ہوا- اور اسی پر ختم ہو گیا-

میر عسکری رئیس کی زبانی وہ بند پڑھیے جس کا مطلع ہے-

نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری

دسویں اور گیارہویں بند میں اپنے فنی نقطۂ نظر اور علمی خدمات کا ذکر ہے-

قلمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفِ جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

روز مرّہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی لب و لہجہ وہی سارا ہو، متانت ہو وہی
سامعین جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی
لفظ بھی چُست ہوں مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

میر حسن، خلیق، انیس، نفیس، عروج اور فائز- دوسری طرف عارف و رشید، ان کے علاوہ، مونس، رئیس، سلیس اور قدیم اور رفائق صاحب- جیسے بزرگوں نے تقریباً دو سو برس تک زبان و ادب کی خدمت کی- جزئیہ و المیہ، مصوری، منظر کشی، فطرت نگاری، جذبات کی عکاسی، واقعات کی مجسمہ سازی اور شاعری یا اردو ادب

کی داستان و تاریخ میں جب بھی مثالی کام کا نام آئے گا تو میر حسن کی سحرالبیان اور میر انیس کے مراثی ہی سامنے آئیں گے اور جب بھی زبان کی عظمت و تاثیر کا تذکرہ ہوگا تو انیس اور ان کے پوتے خورشید علی عروج کے "پڑھنے" کی بات ضرور ہوگی۔ اور زبان و ادب کے پرستاروں میں یہ بات بھی ہمیشہ کہی جاتی رہے گی کہ اردو ادیبوں میں صرف انیس ہی کا خاندان ہے۔ جس کے کم از کم بیس بائیس افراد نے شعر و ادب کو اپنا فن بنایا۔ ہر بزرگ نے تلامذہ اور حلقۂ اثر میں خلوص و فن کی روح پھونکی۔ صدیوں سے اب تک غزل کی ہلکی پھلکی ہیئت نے جن بڑی شاہراہوں کو بند کر رکھا تھا۔ انیس کے خاندان نے ان راستوں سے رکاوٹوں کو ہٹایا، رباعی، سلام اور مرثیہ کو ضمنی حیثیت سے نکال کر مستقل اور بنیادی حیثیت دی۔

انیس اور ان کا خاندان جدید ادب کا بانی ہے۔ ان کا کام اردو زبان کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ان کی فکری عظمتوں نے مشرقی ادب کو بیرونی سطح پر رونمائی کے لائق بنایا۔ اب یہ ہمارا قصور تھا۔ کہ اب تک اعلیٰ تعلیم اور کلاسیکی ادب میں ہم نے مرثیہ کو متعارف نہ کرایا۔ اور دو چار بند، ایک آدھ مرثیہ کو اگر کہیں شاملِ نصاب بھی کیا گیا تو صرف خانہ پری کے لئے اور بس۔

یہی وجہ ہے کہ مغربی درسگاہیں، مرثیہ سے ناواقف ہیں۔ اگرچہ چین، روس، امریکہ اور لندن، فرانس اور اٹلی، ایران اور عرب

کی یونیورسٹیوں میں مراثی پڑھائے جاتے تو انہیں ہماری زبان و ادب کی توانائیوں کا علم ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ انیس کی صد سالہ یاد'' اس غفلت کا مداوا کرے گی۔

انیس اور قومی تشخص کی تحریک

برصغیر میں مسلمانوں کا قومی عروج اورنگ زیب عالمگیر پر ختم ہوگیا۔ بہادر شاہ اول کا مختصر دور اس شبابِ عہد آفرین کا آخری لمحہ تھا۔ علاقائی خود مختاری کی لہر ابھری اور دیکھتے دیکھتے مرہٹے راجپوت، روہیلے اور سکھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ پورے ملک میں زلزلہ سا آگیا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی پھر انگریز نے رہی سہی قوت نچوڑ لی۔ ملک وملت کی جان لبوں پہ آگئی اتفاق سے سراج الدولہ، سلطان ٹیپو اور نجف خان کی دلیری کام آئی۔ اِن لوگوں نے قومی اعزاز کو سہارا دیا۔ ایک نے بنگال کو دوسرے نے میسور کو اور تیسرے نے مرکزی علاقے کو دشمن کی زد سے بچالیا۔ نجف خان نے دہلی سے لکھنؤ تک اور پورے راجپوتوں کے علاقوں میں خود اور اپنے جرنیلوں کے ذریعے مکمل طور پر دشمنوں کا صفایا کر دیا۔ اس سے ملک و ملت کو توانائی ملی۔ لیکن سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو کی شہادتوں نے ایک بازو توڑ دیا۔ پھر سو برس کے اندر اندر شجاع الدولہ کا ملکِ اودھ سیاسی میدان میں مات کھا کر ختم ہوگیا۔

سب سیڈیری سسٹم کے نفاذ اور سقوط اودھ نے قوم کی کمر توڑ دی۔ اِس واقعے نے مسلمانوں کے دل پر گھونسا مارا۔ اب مسلمان دو بیماریوں میں مبتلا تھے، فکری نقطۂ نظر یا قومی نظریۂ حیات کا فقدان دوسرا مرض احساسِ شکست اور ناکامی کے بعد پیدا شدہ مکمل مایوسی، ذہنی انتشار اور معاشی بحران کے ساتھ ساتھ جان کا زیاں اور عزت و ناموس کا نقصان چاروں

طرف خوف و ہراس کا غلبہ، ہر سمت ذاتی تحفظ کی جستجو اور نفسا نفسی کا عالم۔ شکست خوردہ عوام، اور فریب خوردہ خواص یا تو افیم اور جوئے میں راحت تلاش کرنے لگے۔ یا عیش و عشرت میں غم امروز و فردا کو بہلانے میں مصروف ہو گئے۔ انسان جب بے مقصد ہو جائے تو نفسیاتی افراتفری کے شکنجے میں جکڑا جاتا ہے۔ اجنبی طاقت اسے کھلونے دے کر بہلاتی ہے۔ طاؤس و رباب جادو کرتے ہیں۔ اخلاقی آوارگی کے طوفان، فرد کے ساتھ پورے معاشرے کو بہا کر لے جاتے ہیں۔ قوم اس سیلاب میں غرق ہو جاتی ہے۔ دشمن کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے بگڑے ہوئے حالات میں واعظ گردن زدنی اور خطرے کے نقیب دار پر چڑھانے کے قابل قرار پاتے ہیں۔ فرار میں قرار ملتا ہے زندگی کی تلخیوں سے بھاگ کر دیر مغاں یا خانقاہ میں پناہ ملتی ہے اور ان دونوں باتوں سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس طرح قومی تشخص فنا ہو جاتا ہے۔ فرد کے ذہن سے احساس زیاں کا ختم ہو جانا کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔

قومی رہنما ہوں یا بیدار مغز افراد، مفکر ہوں یا خطیب بڑی کشمکش سے دوچار ہوتے ہیں۔ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے شمشیر و سناں کی دعوت دیں تو باغی قرار پائیں اور قوم بھی ساتھ نہ دے۔ آہستہ روی سے قوت حاصل کریں تو راستے میں کچل دیئے جائیں۔ نیا حاکم محکوم کے انتقام سے ڈرتا ہے لہٰذا بولنے والوں کی زبان بندی اور بڑھنے والوں کے قدم توڑنے کی سزا ہر وقت سامنے رہتی ہے۔ اس کے بعد دو صورتیں سامنے آتی ہیں۔ احتیاط سے قوم کا اعتماد بحال کرنے کی سعی کی جائے

اور زندگی کے روشن پہلو سامنے رکھے جائیں۔ اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیئے صرف شاعر ہی کچھ کر سکتا ہے۔ اور ادیب ہی رات میں چراغ روشن کر سکتا ہے۔ کیوں کہ اس کی بات سمجھنے کیلئے اجنبی آدمی کی فہم و فراست بیکار ہوتی ہے۔ وہ اپنے خاص مخاطب سے خاص لہجے میں بات کرتا ہے۔ جسے غیر آدمی نہیں پا سکتا۔

دہلی اور لکھنو، برصغیر کے مسلمانوں میں بغداد و غرناطہ کے ہم رتبہ شہر تھے۔ یہاں کے جیالے خاندانوں نے مقامی حکمرانوں کے مضبوط قلعے فتح کیئے تھے۔ انہوں نے نئی تاریخ و تہذیب کو جنم دیا تھا۔ وہ اس طویل و عریض ملک میں چھوٹے چھوٹے دستے لے کر آئے اور "اللہ اکبر" کہتے بڑھتے چلے گئے۔ ان کا ہر فرد عزت کے نشے میں سرشار اور آبرو کے لیے مرنے کو تیار۔ پوری قوم حکمران اور سربلند تھی۔ دولت کی فراوانی اور حکومت کی عمر طبعی ختم ہوئی تو سب خدا کو بھول چکے تھے۔ جہاد کا جذبہ سرد اور موت کی محبت گرد ہوتے ہی مرکزی نقطۂ حرارت و زندگی فنا ہو گیا۔ اب جو انگریزوں نے ملک پر قبضہ کیا تو قوم گھبرا گئی ہاتھ پاؤں بھول گئے۔ جو اس جانے رہے، گھروں کے اجڑنے بچوں کے قتل، عورتوں کی بے آبروئی، آوارہ وطنی، لاوارثی اور آزادی میں قید و بند کی سختیاں عام تھیں۔ ان دھڑکتے دلوں کی تقویت، روتی آنکھوں کا مداوا۔ اور گرتی دیوار کو سہارا دینے کے واسطے انیس کے فکر و فن نے انگڑائی لی۔ انہوں نے اصل مرض کو دریافت کیا۔ اس کے دُور رس اثرات کا قلع قمع کرنے کے لئے تریاق تیار کیا۔ اسی معاشرے کی بات ملک و ملت کے دلوں میں بیٹھی ہوئی درد بھری تاریخ۔ ایسی تاریخ جو صدیوں

سے قوم کو رلا رہی تھی۔ جس کی یاد میں ثواب بھی تھا۔ اور سبق آموزی بھی۔ میر انیس نے اس نکتے کو پا لیا۔ اِس نکتے کو پھیلایا اور سمندر بنا دیا۔ انیس نے مرثیے میں شگفتہ تمہید کا اضافہ کیا۔ تاکہ سننے والوں کے ذہن بات سمجھنے کے لئے تیار ہوں۔ پھر اس سبکی اسلوب کو بدلا گریہ خیز طریقے کو نیو ر دے کر ایک عظیم شخصیت کو اس کے ماضی میں لے گئے۔ اِس کا جاہ و جلال اور عظمت و جلالت کو مصور کیا۔ پھر اس کی آوازیں سنائیں اور بہت سے آوارہ وطن افراد کو ایک ایک کر کے مجسم کیا۔ لڑکیاں، معزز خواتین، کنیزیں، غلام بچے، جوان، سردار اور امام سب کو جنگاہ میں دیکھا۔ اور سب دکھایا۔ بات کچھ ایسے انداز سے کی کہ دل میں اتر گئی اور احساسِ شکست کو یقینِ فتح میں بدل دیا۔

حبیب، ابنِ مظاہر اور حر ابن یزید ریاحی، حضرت علی اکبر و حضرت عباسؑ حضرت عون و محمد و قاسمؑ اور امام حسین علیہم السلام کا وطن سے نکلنا راستے کی مشکلوں کا سامنا کرنا، کربلا میں اترنا۔ جنگ کو ٹالنا پھر موت کا استقبال، فوجوں کے سامنے ایک ایک مجاہد کی زبان سے۔ ذاتی اور قومی تشخص کا اظہار کرنا اور "انا" کا بیان۔ رجز مجاہد کا سراپا، دشمن کی تصویر بنائی۔ مجاہد کا جوش و جذبہ، اس کے بعد ایک پر ہزار کی یلغار، ہر ایک کی جنگ و پیکار، پھر شہادت سے سرخروئی کے نتائج، رسولؐ کی اولاد کا بین کرنا۔ اور خدا کا صلہ دینا۔ بار بار لکھا۔ پڑھا اور عوام کو سنا کر یہ حقیقت سمجھائی کہ خوف و ہراس کا نتیجہ اچھا نہیں، اللہ پر بھروسہ اور اس کی رحمت و نصرت کا یقین توانائی کا سرچشمہ، عزت کی بنیاد اور ترقی کا زینہ ہے۔

انساں ہی کچھ اس دور میں پامال نہیں | سچ ہے کوئی آسودہ و خوش حال نہیں
اندیشۂ آشیان و خوفِ صیاد | مرغانِ چمن بھی فارغ البال نہیں

ادبار کا کھٹکا حشم و جاہ میں ہے | جاگو جاگو کہ خوف اسی راہ میں ہے
اٹھو اٹھو یہ خوابِ غفلت کب تک | دیکھو دیکھو! اجل کمین گاہ میں ہے

توقیر، تیرے ہی آستانے سے ملی | عزت تیرے در پہ سر جھکانے سے ملی
مال و زر و آبرو و ایمان | کیا کیا دولت ترے خزانے سے ملی

دولت کی ہوس ہے، نہ طمع مال کی ہے | خواہش منصب کی ہے نہ اقبال کی ہے
ہے ذات تیری جواد و غفار و غنی | امید تجھی سے ترے افضال کی ہے

بھیانک ماحول اور گھٹی گھٹی فضا میں انیسؔ نے عجب عجب اطمینان آفریں تصویریں دکھائی ہیں، یہ چہرے بولتے ہیں ان کے کردار خطروں کو جھیل کر فتح مندیوں کا درس دیتے ہیں اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے کی ادا سمجھاتے ہیں، کربلا کی خوں آشام تاریخ کا بہادر مجاہد، ضعیف اور بوڑھا شہید، حضرت حبیب ابن مظاہر:

گردن جو جھکی جاتی ہے سر تن پہ گراں ہے | افسوس، بہارِ چمن عمر خزاں ہے
جو تیر سا قد تھا، سو وہ خم مثلِ کماں ہے | جانے کا یہی گوشۂ مرقد کا نشاں ہے

ہے تیغوں کی دھاروں سے گذرنا کوئی دم کو
ہر دم یہ دعا ہے کہ نہ لغزش ہو قدم کو

یاس کا مجسمہ رجا کی تصویر بن کر تیور بدلتا ہے

اتنے میں رجز پڑھ کے پکارا وہ خوش انجام | اے قوم حبیب ابن مظاہر ہے مرا نام
ہشیار کہ اب میان سے کھنچتی ہے یہ صمصام | وار اس کا ہے دشمن کیلئے موت کا پیغام
یہ تیغ نہیں وہ کہ دم حرب رکے گی | میں تم سے رکوں گا نہ مری ضرب رکے گی
گو ہاتھوں میں رعشہ ہے پر او ظالم گمراہ | گر کوہ کو چاہوں تو اکھاڑوں صفت کاہ
ان ہاتھوں کی قوت سے ابھی تو نہیں آگاہ | ہے قدر شناس ان کا جگربند ید اللہ
پیری سے جو ہے پشت خمیدہ تو بجا ہے | جس خاک میں جانا ہے ادھر سر بھی جھکا ہے
پیری سے ہے روشن کہ چراغ سحری ہوں | دنیا سے کوئی دم میں عدم کا سفری ہوں
آقا مرا شاہد ہے کہ عصیاں سے بری ہوں | دیندار ہوں، غازی ہوں، مجاہد ہوں، جری ہوں
بے خوف چلا جاتا ہوں میں تیغ کے منہ پر | دعویٰ ہو تو آؤ مری شمشیر کے منہ پر
سینہ تیروں کا سپر ہے تو کبھی منہ کو نہ موڑوں | نیزوں کا ہر اک بند انہیں ہاتھوں سے توڑوں
ہاتھ آؤ تو ٹکرا کے سر اک ایک کا پھوڑوں | جیتا شہ مظلوم کے دشمن کو نہ چھوڑوں

کچھ ڈھال کی حاجت نہیں مشتاق اجل کو
دانتوں سے چبا جاؤں گا تلوار کے پھل کو

قوم کے بڑے بوڑھے ۱۸۵۷ء کی شکست سے پژمردہ تھے اور انیس کے حاضرین میں بہت سے لوگ لڑنا بھی جانتے تھے، کچھ لوگ معرکہ میں نبرد آزما بھی ہوئے ہوں گے۔ اکثریت ایسے ماحول کی پروردہ تھی۔ جس میں دلاوری کے قصے کہے سنے جاتے تھے۔ لیکن مجلس میں پورا مجمع ان لوگوں کا تھا جو ماضی سے رشتہ توڑ کر حال کی حسرتوں میں ڈوبے ہوئے تھے انیس نے ان کے ذہنی اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر برسر منبر سمجھایا کہ جس قوم کے افراد بہادری کی موت قبول کریں اس قوم کے جوانوں کو شرمانا زیب نہیں دیتا اور جس قوم کے بوڑھے حبیبؓ کے جذبات سے سرشار ہوں وہ قوم ہمت نہیں ہار سکتی

حبیب ابن مظاہر، امام حسین علیہ السلام کے پرانے دوست دار تھے۔ ان کا تعلق اِن مخلصوں سے تھا۔ جو امام پر جان نثار کرنے میں پس و پیش نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے مقابلے میں ایک ایسی شخصیت کا تذکرہ بھی پڑھیے جیسے انیسؔ نے بار بار لکھا ہے۔ وہ شخص مدتوں سے دشمنوں کا ساتھی، مخالف قوم کا سپہ سالا تھا۔ لیکن حق و صداقت کا انکشاف ہوتے ہی اس نے عزت و اقتدار کو ٹھکرا دیا۔ اور اس قوم کے ساتھ شریک جہاد ہو گیا جسے تباہ کرنے کے منصوبے میں وہ خود بھی شریک تھا۔ حُر نے ابن سعد کا ساتھ عین میدانِ جنگ میں چھوڑ دیا۔ وہ جان بوجھ کر تیروں کی بارش میں نہاتا اور تلواروں کے سیلاب میں غوطے لگاتا، شہادت کی طلب میں امام حسینؑ کے قدموں تک پہنچ گیا۔ انیسؔ نے حر کی کردار نگاری پر بار بار توجہ کی اور لوگوں کو حر کے نفسیات، اخلاقی اور عملی پہلوؤں کی جانب متوجہ کیا۔ ان کا مقصد تھا کہ قوم میں انفرادیت کی حامل شخصیتیں ہر گروہ سے پیدا ہوتی رہیں۔ اور یہ کہ حسینی شخصیت کو ابھرنے میں دیر نہیں لگتی لگن اور جذبے کی بات ہے عزیمت و استقلال کی شرط ہے۔

ابن زہراؑ ہے جگر بند رسولِ مختارؐ — میرا کیا منہ جو کروں مدح امام ابرار
اک زمانہ صفتِ آلِ عبا کرتا ہے — آپ قرآں میں خدا ان کی ثنا کرتا ہے

کیا ہیں، اور کیا وہ ریاست مری کیا میرا محل — جب کہ آفت میں پھنسے احمدؐ مختار کی آل
واں کی املاک و زراعت کا ہو کیا مجھ کو خیال — یاں ہوئی جاتی ہے سادات کی کھیتی پامال
گھر کا اب دھیان نہ بچوں کا الم ہے مجھ کو — خانہ بربادیِ شبیرؑ کا غم ہے مجھ کو

عملِ خیر سے بہکا نہ مجھے او ابلیس — یہی کونین کا مالک ہے یہی راس و رئیس
کیا مجھے دیگا تیرا حاکم ملعون و خسیس — کچھ تردد نہیں کہہ دے کہ لکھیں پرچہ نویس
ہاں اسی سوئے ابن شہنشاہ عرب جاتا ہوں — لے ستم گر جو نہ جاتا تھا تو اب جاتا ہوں

حر کے نزقی پذیر نفسیات ، بے خوف حق پرستی ، نڈر ہو کر امام کے لئے آگے بڑھنا ، ایمان و اسلام کی خاطر جہاد کرنا ، فرد کے کردار کا اثر انگیز تعارف ہے ۔ انیس نے ایسے افراد کا بار بار تذکرہ کر کے قومی شعور کو نشو و نما دینے کا فرض ادا کیا ہے ۔ قوم کے لاشعور کو فردِ ملت کے امتیازی صفات کا درس دے کر مجموعی طور پر تشخص حاصل کرنے کا مشورہ دیا ہے ۔ حکومت اور فوج کی طاقت اور کثرت سے ڈرے بغیر دشمن پر ٹوٹ پڑنا مردانگی ہے ۔

حر نے نعرہ کیا ، یا حیدرِ صفدر مددے	وقتِ امداد ہے یا فاتحِ خیبر مددے
زوجِ زہرا مددے ، نفسِ پیمبر مددے	بندۂ آل ہوں یا خواجۂ قنبر مددے
تن تنہا ہے غلام اور بہت ظالم ہیں	آئی آواز کہ اے حر ترے حامی ہم ہیں

اس تمہید کے بعد انیس کہتے ہیں ؛

مل گئی راہ خدا ، واہ رے اقبال ترا	پاک عصیاں سے ہوا نامۂ اعمال ترا
جرم ماضی ہوئے سب عفو ، خوشحال ترا	جلد جا جلد کہ شائق ہے سرا لال ترا

مرد ہے جس کی یہ ہمت یہ ارادہ ہووے
ہاں بہادر ، تری توفیق زیادہ ہووے

انیس نے مرثیہ میں حرکت و حرارت کی قوت پیدا کر کے اربابِ مجلس کو اداسی اور مجبوری کے شکنجے سے نکالا ، انہیں ماضی کے حوالے سے حیات آفرین کردار یاد دلائے ، خونخواروں کے جنگل میں امام حسینؑ کا باغ کٹ رہا تھا ۔ لیکن قوم کے ارادے بلند تھے جب تک زندہ رہے لڑے اور جب گر گئے تو نام کے جھنڈے گاڑ دیئے ۔ مثلاً حضرت عباس جن کے بارے میں انیس نے بڑے نفیس مرثیے لکھے ہیں ان کی بہادری ، وفاداری ، صبر اور سپہ سالاری ناموری اور مثالی کوششوں کو بڑے جوش سے لکھا ہے ۔ قاری

ہو یا سننے والے۔ حضرت عباسؑ پر انیسؔ کے مرثیے پڑھنے کے بعد جوش و دلاوری کے جذبات خود بخود کروٹ بدلنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ جذبات نعرہ اور خروش بننے کے بجائے تحمل و اعتدال، وقار اور وزن حاصل کر لیتے ہیں۔ حضرت عباس کی زبان سے رجز کا حق انیسؔ نے ادا کر دیا ہے۔ اِس موقع کی مناسبت سے ان کا مرثیہ ہے۔

اے تیغ زباں جوہر تقریر دکھا دے

حضرت عباس کی محبت ان کی عقیدت، اخلاص اور کردار کی جامع تصویر دیکھنا ہو تو اِس مرثیہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ اِس میں ابن سعد اور حضرت عباسؑ کا مکالمہ نظم ہے۔ حضرت عباسؑ یزید سے مفاہمت کا سوال رد کرتے ہیں۔ اور امام حسینؑ سے ایک آن الگ ہونے کا تصور بھی دور از امکان قرار دے کر اپنے موقف کی تعریف فرماتے ہیں۔ وہ دشمن کو ٹھکراتے اور تاریخی پس منظر میں اپنے قومی تشخص پر روشنی ڈالتے ہیں۔

جب گھر سے پئے جنگ قدم ہم نے نکالے
کعبہ سے وغا کر کے صنم ہم نے نکالے
دم میں تنِ کفار سے دم ہم نے نکالے
اسلام کے لشکر کے علم ہم نے نکالے

رنگِ رخ کفارِ عرب ہو گیا فق سے
اک ضرب میں باطل کو جدا کر دیا حق سے

میں حشمتِ دنیا کی تمنا نہیں رکھتا
قطرے کی طرح فیض کا دریا نہیں رکھتا
اعلیٰ جو ہے ادنیٰ کی وہ پروا نہیں رکھتا
پتے سے علاقہ سر طوبیٰ نہیں رکھتا

کافر کی طرف صاحب ایماں نہیں جاتے
بت خانے میں کعبے سے مسلماں نہیں جاتے

خورشید کو محتاجی ذرہ نہیں ذرا
دیندار سدا کرتے ہیں کافر پہ تبرّا
ظالم ترے حاکم کو ہے کس بات کا غرّا
اسلام سے عاری ہے۔ تو ایماں سے معرّا

قارون کا خزانہ ہو تو عزت نہیں ملتی
دولت سے کمینے کو شرافت نہیں ملتی

کچھ خارِ مغیلاں گلِ تر ہو نہیں جاتا ہر قطرۂ ناچیز گہر ہو نہیں جاتا
قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں جاتا مس پر جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں جاتا
جس پاس عصا ہو اسے موسیٰ نہیں کہتے ہر ہاتھ کو غافل یدِ بیضا نہیں کہتے
دولت نہیں انسان کی کچھ قدر بڑھاتی دنیا کے دنی کام ہیں کس کے نہیں آتی
گو فقر ہو، عالی نسبی پر نہیں جاتی بینا جو ہیں وہ دیکھتے ہیں جوہرِ ذاتی
محتاجی سے کم رتبۂ عالی نہیں ہوتا۔
عزت وہ خزانہ ہے کہ خالی نہیں ہوتا

قومی غیرت کو ابھارنے کا اس سے بہتر حسین اسلوب کیا ہوگا عارضی شکست اور سیاسی پس ماندگی سے قوم پر انفعال طاری تھا۔ انیس نے فعالیت کو چھیڑا، جوہرِ ذاتی کی اہمیت بتائی جاندار قومی تشخص کے لئے چند اعتمادی اور مثبت صفتیں بھی بتائیں مثلاً یہ عقیدہ۔

- جب خدا چاہے تو بگڑے ہوئے بن جاتے ہیں
- مرد ہے جس کی یہ ہمت یہ ارادہ ہووے
- ہاں بہادر، تری توفیق زیادہ ہووے
- اسلام کے لشکر کے علم ہم نے نکالے
- دین دار سدا کرتے ہیں کافر پہ تبرّا!۔
- جس پاس عصا ہو اسے موسیٰ نہیں کہتے۔
- بینا جو ہیں وہ دیکھتے ہیں جوہرِ ذاتی۔
- عزت وہ خزانہ ہے کہ خالی نہیں ہوتا۔

انیس کے مخاطب اور لکھنؤ کے مسلمان جم کر لڑ چکے تھے۔ برصغیر میں جنگِ آزادی کا سب سے بڑا رن یہیں پڑا تھا۔ انگریزی قلعہ ریذیڈنٹ ہاؤس کے در و دیوار ابھی تک ان جیالوں کی نبرد آزمائی پر مہرِ جواں مردی

ثبت کر رہے ہیں، ریزیڈنسی کے باغ میں بڑے بڑے کرنلوں کی قبریں مسلمانوں کی قوتِ بازو کے نقش کالحجر ہیں۔ اس کے باوجود آخر میں ہار گئے اور اس ہار کا ردِ عمل بہت سخت ہوا۔ میر انیس نے اس ردِ عمل پر بند باندھا، دوستوں کو ایک بہت بلند شخصیت کی زبانی یہ سنوایا وہ دشمنوں سے کہہ رہے ہیں۔

سر کو نہ سر، نہ جان کو ہم جاں سمجھتے ہیں ہاں حکمِ کردگار کو ایمان سمجھتے ہیں۔
مشکل ہزار ہو اسے آسان سمجھتے ہیں ہم ایک اور لاکھ کو یکساں سمجھتے ہیں
اس معرکے میں کھیت پڑے ہیں اسی طرح بچے ہمارے تم سے لڑے ہیں اسی طرح
لڑتا نکل کے ایک سے گر ایک نامدار برسوں بھی تم سے ختم نہ ہوتی یہ کارزار
نکلا ادھر سے ایک ادھر سے بڑھے ہزار اس پر بھی الاماں کا غل اٹھتا تھا بار بار
بے دیں کا ساتھ دے کے حمیت کو کھو دیا تم نے تو آج نام عرب کا ڈبو دیا

یہ واقعہ سب نے دیکھا تھا کہ بیرونی کمک اتنی بڑی آ جاتی تھی جس کا مقابلہ ایک فوج یا ایک جرنیل سے ممکن نہ تھا۔ پھر بھی الاماں کا غل اٹھتا تھا بار بار۔ اس حقیقت کو یاد رکھنے سے ٹوٹے دل سنبھلتے تھے۔ اور اس سنبھالے میں عورتوں کا صبر، خواہین کا حوصلہ، بچوں کا جذبہ و جوشِ جہاد کا بیان، "ایک تحریک" کو آگے بڑھانے کی سعی کامیاب ہے۔ انیس نے عون و محمد کی زبان سے جو کہلوایا ہے۔ اور علم فوج حاصل کرنے کے لئے جن خیالات کی ترجمانی کی ہے اسے جنگِ آزادی برصغیر کے سیاسی پس منظر میں رکھ کر پڑھیے صاف نظر آتا ہے کہ انیس نئی نسل کو قومی قیادت کے لیے مثالی کردار سمجھانا چاہتے ہیں۔

جب قطع کی مسافتِ شبِ آفتاب نے

بہت عمدہ مرثیہ ہے جس پر تفصیلی بحث ملے گی منتخب مراثی انیس

میں لکھی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس میں غیرت مندوں کے نفسیات کا دل کش بیان کرتے ہوئے وہ وقت لاتے ہیں کہ حرم سرا کے اندر امام حسین علیہ السلام فوجی لباس زیب تن فرما رہے ہیں خواتین سامنے کھڑی ہیں:

ہتھیار ادھر لگا چکے آقائے خاص وعام
تیار ادھر ہوا علم سید الانام!
کھولے سروں کو گرد تھیں سیدانیاں تمام
روتی تھی تھامے چوب علم خواہر امام
تیغیں کمر میں، دوش پہ شملے پڑے ہوئے
زینب کے لال زیر علم آ کھڑے ہوئے

چھوٹے چھوٹے بچے میدان کی قیادت کے لئے مچلتے اور پرچم لینے کا استحقاق طرح طرح سے ثابت کرتے ہیں۔ عون و محمد کا علم طلب کرنا اور ان کی جنگ کے تفصیلات کا مطالعہ کیجیے صاف نظر آتا ہے کہ انیس نے یہ خاکہ خود تیار کر کے ان کے ذریعے نئی نسل کو جرأت و فتح مندی کے پیغام دلواتے ہیں انیس مثالی بچوں کی یاد دلا کر نئی نسل اور نئی قوم کو اس معیار پر لانے کے خواہشمند ہیں کہ گھر کا ماحول ایسا تیار کیا جائے کہ قومی قیادت اور متوقع جنگ کے وقت بزرگوں کی تیاریوں کے ساتھ بچوں کی امنگ بھی ہو۔

گہ ماں کو دیکھتے تھے کبھی جانب علم
نعرہ کبھی یہ تھا کہ نثار شہ امم
کرتے تھے دونوں صلاح کبھی مشورے بہم
آہستہ پوچھتے کبھی ماں سے وہ ذی حشم

کیا قصد ہے علیؑ ولی کے نشان کا
اماں کسے ملے گا علم نانا جان کا
کچھ مشورہ کریں جو شہنشاہ خوش خصال
ہم بھی محق ہیں آپ کو اسکا ہے خیال
پاس ادب سے عرض کی ہم کو نہیں مجال
اس کا بھی خوف ہے کہ نہ ہو آپ کو ملال
آقا کے ہم غلام ہیں اور جاں نثار ہیں
عزت طلب ہیں، نام کے امیدوار ہیں

زینبؑ نے تب کہا تمہیں اس سے ہے کام کیا؟
عمریں قلیل، اور ہوس منصب جلیل
اچھا نکالو قد کے بھی بڑھنے کی کچھ سبیل
ماں صدقے جائے، اگرچہ یہ ہمت کی ہے دلیل
ہاں اپنے ہم سنوں میں تمہارا نہیں عدیل
لازم ہے، سوچے غور کرے پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ کیوں بشر اس کی ہوس کرے
ان ننھے ننھے ہاتھوں سے اٹھے گا یہ علم؟
چھوٹے قدوں میں سب سے، سنوں میں سبھوں سے کم
نکلے تنوں سے سبط نبیؐ کے قدم بہ دم
عہدہ یہی ہے بس، یہی منصب، یہی حشم
رخصت طلب اگر ہو، تو یہ میرا کام ہے
ماں صدقے جائے، آج تو مرنے میں نام ہے
پھر تم کو کیا، بزرگ تھے گر فخر روزگار
زیبا نہیں ہے فخر اضافی پہ افتخار

جوہر وہ ہیں جو تیغ کرے آپ آشکار
دکھلا دو آج حیدر و جعفر کی کارزار
تم کیوں کہو کہ لال خدا کے ولی کے ہیں
فوجیں پکاریں خود کہ نواسے علیؑ کے ہیں

اِسی موضوع پر ایک مرثیہ کا مطلع

دوزخ سے جو آزاد کیا حُر کو خدا نے

اس مرثیے میں انیس نے قوم کے بلند ترین کردار کا تذکرہ اور زندۂ جاوید صفات کا تعارف کرایا ہے۔ ان شہیدوں کو عقیدت کے ہدیے پیش کئے ہیں۔ جو خود تو جام شہادت نوش کر چکے مگر آنے والی نسلوں کو آبحیات کے چشمے بتا گئے ہیں۔

اللہ ری وفائے رفقائے شہ ذیجاہ
دِل سینوں میں لبریزِ وِلائے شہ ذیجاہ
سر دینے تھے ہنس ہنس کے برائے شہ ذیجاہ
کرتے تھے سفر چوم کے پائے شہ ذیجاہ
دنیا کی نہ جانب ہیں نہ دریا کی طرف ہیں
مرتے ہوئے آنکھیں شہ والا کی طرف ہیں

مرنے پہ کسے تھا کمر، ایک ایک سے پہلے
کر دیتا تھا سینہ سپر، ایک ایک سے پہلے
دیتا تھا بصد شوق سر، ایک ایک سے پہلے
کرتا تھا دلِ شہ میں گھر، ایک ایک سے پہلے
دشوار انہیں زیست کی ایک ایک گھڑی تھی
کوثر سے نظر، خلد سے جان ان کی لڑی تھی

اس کے بعد انیس ایک گوشہ نکال کر عورتوں کی قومی غیرت و

حبا و کردار کا تذکرہ چھیڑتے ہیں۔

وہ ابنِ مظاہر کہ حبیبوں میں جو تھے فرد
دنیا میں کسے ملتے ہیں اس طرح کے ہمدرد
اعدا کے لئے تیغ ھلالی دم ناوردد
پیری میں اولوالعزم بڑھاپے میں جوانمرد
سب چھوٹے مگر دامنِ حضرت نہیں چھوڑا
مرنے پہ بھی اب تک درِ دولت نہیں چھوڑا[1]
جب دے چکے سب غیر عزیزوں کی طرح سر
بے جاں ہوئے دو ایلچی شاہ کے دلبر
مرنے پہ کمر باندھتے تھے قاسم بے پر
کہتی تھی جھکائے ہوئے سر شاہ کی خواہر
ہے سخت عجب دونوں کی دانائی سے مجھ کو
ان بیٹوں نے محجوب کیا بھائی سے مجھ کو
کم عمر ہیں، عزت کی وہ کیا بات کو جانیں
سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ پھراتے ہیں زبانیں
ہے ہے انہیں شبیر سے پیاری ہو نہیں جانیں
پچھتائیں گے، روئیں گے نہ کہنا مرا مانیں
اب نیر جگر گوشۂ زہرا یہ چلیں گے،
جب وقت نکل جائے گا۔ پھر ہاتھ ملیں گے
وہ نام پہ مرتے ہیں، جو ہیں عاقل و ذی ہوش
سب دل میں کہیں گے کہ ہوئے جنگ سے روپوش

---

[1] جناب حبیب ابن مظاہر رضوان اللہ علیہ کی قبر امام حسین علیہ السلام کی قبر مبارک سے پہلے رواق میں ایک چاندی کے کٹہرے میں موجود ہے۔

موقع ہو تو گویا بھی کہیں رہتے ہیں خاموش
کیا جان کا بھر دھیان، شجاعت میں ہو جب جوش
فرق ان کے تہوّر میں کسی طور نہیں ہے
باعث یہ لڑکپن کا ہے کچھ اور نہیں ہے
تلواروں میں دم عشق کا بھرتے ہیں وفادار؟
سر دینے میں سبقت کہیں کرتے ہیں وفادار؟
موقع ہو تو دنیا سے گذرتے ہیں وفادار
سردار سے پہلے کہیں مرتے ہیں وفادار؟
خنجر دلِ زہرا پہ جو چل لے تو سدھاریں
ماں خیمے سے سر ننگے نکل لیں تو سدھاریں
میں سمجھی تھی پہلے ہی، یہ ڈھونڈیں گے بہانا
کچھ منہ کا نوالا نہیں تلواروں کا کھانا
لازم تھا اسی وقت انہیں خیموں میں لانا
سچ ہے کہ وفاداروں سے خالی ہے زمانا
جنس تیغ میں، نہ تاثیر زبانوں میں نہیں ہے
عنبروں میں اب الفت ہے یگانوں میں نہیں ہے
کم عمر ہیں بچے ہیں، یہ کیا وقت کو جانیں
رخ زرد ہیں لب خشک ہیں سوکھی ہیں زبانیں
وال تیغوں میں تا پیش ہے، کڑکتی ہیں کمانیں
جو نام پہ مرتے ہیں وہ دے دیتے ہیں جانیں
مذکورِ بزرگانِ خوش اوقات تو رہ جائے
جانیں نہ رہیں، گھر نہ رہیں، بات تو رہ جائے

اس طنزیہ اور تیز لہجے کے بعد بچے عرض کرنے اور ماں پیار سے سمجھاتی ہیں

بھرا کے وہ بولے کہ ہماری نہیں تقصیر
قسمت میں خجالت تھی، نہ یاور ہوئی تقدیر
فرمایا: شجاعت کے منافی ہے یہ تقریر
مسلم کے پسر کا ہے تھے صاحبِ شمشیر؟
جاتے ہوئے کس وقت کو آقا نے نہ روکا
روکا تمہیں، ان گوشۂ والا نے نہ روکا
جو مرد ہیں پہلے وہی مر جاتے ہیں پیارو
آزردہ تھی، پر خبرِ خوشی اب ہوں سدھارو
صدقے گئی الجھی ہوئی زلفوں کو سنوارو
واری، یہ تمنا ہے کہ سر ماموں پہ وارو
سر دے کے جسے پاتے ہیں وہ راہ یہی ہے
صدقے گئی، شادی ہے یہی، بیاہ یہی ہے

جس قوم میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس قوم میں ایسے خاندان پیدا ہو جاتے ہیں۔ جنہیں گھر سے زیادہ میدانِ جنگ محبوب ہوتا ہے، جن کی مائیں موت کے لئے بچوں کو آراستہ کرتی ہیں اور ان کے بچے بے مقصد زندگی کو با مقصد موت سے بدل کر خود زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں اور ان قوموں کو زندہ رہنے کے طریقے سکھا جاتے ہیں جو انہیں اپنا مانیں، دیکھیے موت تحریکِ حیات کرتی ہے نہ

پوشاک بدل کر جو سجے جنگ کے ہتھیار
غل تھا کہ چلے شاہ کی ہمشیر کے دلدار
مجرے کو جھکے ماں کے، جو وہ آئینہ رخسار
سینے میں تڑپنے لگا زینبؑ کے دلِ زار

فرمایا: ادا سر سے کرو حقِ شہِ دین کا
لو جاؤ! مبارک ہو سفرِ خلدِ بریں کا
یلوہ ہو تو پروانہ رہے بھائی پہ بھائی
مثلِ جسد و روح نہ دم بھر ہو جدائی
دکھلائیو ان چھوٹے سے ہاتھوں کی صفائی
جانیں جو لڑاؤ گے تو سر ہو گی لڑائی
گر مر گئے تو قبر بھی عزت بھی ملے گی
ہیں دودھ بھی بخشوں گی شہادت بھی ملے گی
دم ہونٹوں پہ آجائے اگر پیاس کے مارے
غش کھا کے جو گر جاؤ بھی تو دریا کے کنارے
پانی کو ترستے رفقا مر گئے سارے
یہ آبِ رواں بند ہے۔ ماموں پہ تمہارے
تلواریں ہیں! موجوں کی روانی نہ سمجھنا
دریا ہے لہو کا اسے پانی نہ سمجھنا

انیس واعظ نہیں کہتے وہ اخلاق کے مدرس نہیں
جو بنیوں کی طرح خطابت اور لیڈروں کی طرح تقریر ان کا
پیشہ نہیں، وہ مفکر و دانشور ہیں وہ یہ سب کچھ کرنا چاہتے
ہیں۔ مگر عام انداز سے ہٹ کر ان کا اسلوب واقعاتی ہے
وہ لاجواب مثالوں کے بیان سے نتیجۂ کلام، مقصد گفتگو
اور روح مدعا سمجھنا جانتے ہیں وہ ایسی فضا تیار کرتے
ہیں کہ سننے والا ان کی بات پوری طرح سمجھ سکتا ہے
پڑھنے والا تمام جزئیات پر غور کر سکتا ہے۔ انیس کوئی بات
سرسری طور پر نہیں کرتے ان کے اندازِ بیان میں ایہام یا ابہام

نہیں ہے۔ کربلا کے شہیدوں کو ابدی پیغام کا امین سمجھنے والوں سے ہر بات کو کھول کر کہہ دیتے ہیں۔ اس غرض سے انہوں نے شہدائے کربلا کو سننے والوں کے ماحول میں زندہ فرض کر کے گفتگو کی ہے تاکہ اجنبیت کا احساس پردہ نہ بن سکے۔ ان کا مدعا فقط واقعہ نگاری نہیں ہے وہ صرف خشک روایت بیان کرنا نہیں چاہتے، انیسؔ نے ایک واقعہ کو اپنی نظر سے دیکھا، پھر اس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھا اس کے بعد اسے اپنے ماحول اور معاشرے کی فضا میں ابلاغ و افہام کی خاطر منتقل کیا ہے۔ وہ نتائج و فوائد پر زور دیتے ہیں اور اس نکتے کو ان کا قاری آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

عون و محمدؑ کی جنگ کا بیان دیکھیے مذکورہ بالا مرثیے میں بچوں کے نفسیات ماں کے خیالات کا مطالعہ کر چکے۔ ایک اور مرثیہ دیکھیے

زینبؑ نے سنی جب یہ خبر شاہ امم سے
مسلم کے پسر خوب لڑے فوج ستم سے

خواتین کے جذبات، شجاعت و ایثار کے تذکرے ہی سے بات شروع ہوتی ہے۔ جناب مسلم بن عقیل کی زوجہ نے ایک مقصد کے لیے اپنی اولاد کو جس شان سے لڑنے بھیجا۔ فرزندان مسلم نے جس شان سے جنگ کی اور جس بانکپن سے شہید ہوئے اس سے ایک اور کردار سامنے آیا انیسؔ نے عظیم المرتبت ماں کی تربیت پر دوبارہ روشنی ڈالی۔ ایک قربانی کے بعد دوسری قربانی کا تذکرہ اس لیے کرتے ہیں، کہ قوم جانفروشی سے گھبرا جائے اور مائیں اگر اپنا فرض چھوڑ دیں تو زندگی موت سے بدتر ہو جاتی ہے۔ وہی قوم اپنا تشخص برقرار رکھ سکتی ہے جس کی عورتیں بچوں کو خدا کے نام اور پاک مقصد کی آن پر

قربان کرنے کا سبق دیتی ہوں۔ جن کی اولاد اپنی روایت کو آگے بڑھائے

کچھ منہ سے نہ کہتی تھی، مگر تھا یہ اسے دھیان
شہ پر مرے بیٹے ہوں اسی طرح سے قربان
آگے تو یہ حسرت تھی، کہ ہو بیاہ کا سامان
اب کوئی تمنا نہیں، گر ہے تو یہ ارمان
چرچا ہو کہ حق ماں کا ادا کر گئے دونوں.
کس شان سے زینبؑ کے پسر مر گئے دونوں
کیا زوجۂ مسلم کی بھی تھی نیک کمائی
شبیرؑ کے جو کام برے وقت میں آئی
ممنون ہوئی احمدِ مختار کی جائی
رتبہ ملا عزت ملی توقیر بھی پائی
کس طرح نہ ہو مادرِ غم ناک رضا مند
چاروں سے ہوئے پنج تن پاک رضا مند
دل سے یہ بیاں کرتی تھی زینبِ جگر افگار
اتنے میں پسر آ کے گرے قدموں پہ اک بار
کی دستِ ادب جوڑ کے یہ عون نے گفتار
ہے بھائی میں اور مجھ میں بڑی دیر سے تکرار
میں کہتا ہوں مرنے کو مجھے جانے دو پہلے
یہ کہتے ہیں تلواریں مجھے کھانے دو پہلے
کب تک میں بھلا رنج عزیزوں کے اٹھاؤں
سمجھائیں انہیں آپ تو میں مرنے کو جاؤں
زخم تبر و تیر و سناں سینے پہ کھاؤں
اعدا کو شجاعت شہِ مرداں کی دکھاؤں

مردوں کا دلیروں کا یہی کام ہے اماں
لڑتے ہیں جو اکیلے تو بڑا نام ہے اماں
یہ کہہ کے جو خاموش ہوا عونِ خوش اطوار
صدمے سے نہ چھوٹے کو رہی طاقتِ گفتار
بس آنکھوں کو مل مل کے وہ رونے لگا یکبار
کی عرض سنا آپ نے اے مادرِ غمخوار؟
کیا جانیئے کس بات پہ یہ ہم سے خفا ہیں
ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ باپ کی جا ہیں
چھوٹے ہیں جواب اس کا بڑے بھائی کو کیا دیں
اچھا ہمیں لاکھوں سے یہ لڑنے کی رضا دیں
پیچھے جو ہٹیں پاؤں تو جو چاہیں سزا دیں
میداں سے خدا اچھا ہے تو لشکر کو بھگا دیں
جاں بازوں کے نزدیک نہیں ملکِ عدم دور
نہ فوجِ ستم دور نہ یہ دور نہ ہم دور
دنیا میں کوئی اور بھی ہے ہم سا دلاور،
ہم شیر ہیں شیروں کو نہیں مرنے کا کچھ ڈر
اک حملے میں گر ہم نہ الٹ دیں صفِ لشکر،
بھر دودھ نہ اپنا ہمیں تم بخشیو! اے مادر
شہ کے قدمِ پاک پہ سر دے کے بچھڑیں گے
یا رن سے سرِ شمر و عمر لے کے پھریں گے،
آپس کی جدائی جو گوارا نہیں پیارو
جھگڑا یہیں چکا دیتی ہوں لو ساتھ سدھارو

ناموں کے جو دشمن ہیں انہیں گھیر کے مارو
سرداروں کے سر چھوٹی سی تیغوں سے اتارو
باندھی ہے کمر دونوں ستم گاروں نے شر پہ
اک شمر پہ حملہ کرے اور ایک عمر پہ
اک شیر سا تیروں کے نیستاں میں در آئے
اک برچھیوں والوں کے پرے خوں میں بھرائے
جس شامی پہ تلوار پڑے وہ نظر آئے
لڑتا ہوا اِک جائے ادھر اک ادھر آئے
میدان جری نام پہ دیتے ہیں سر اپنا
اک ایک الگ لڑکے دکھا دو ہنر اپنا
جھپکے نہ پلک سر پہ جو شمشیرِ اجل آئے
چھاتی پہ لگے تیر تو ابرو پہ نہ بل آئے
قاصر نہ ہو ہمت، نہ شجاعت میں خلل آئے
چھاتی نہ ہٹے سینے پہ برچھی کا جو پھل آئے
لوگ ایسے ہی جانبازوں کو روتے ہیں جہاں میں
شیروں کے پسر شیر ہی ہوتے ہیں جہاں میں
مجھ کو یہ تمنا ہے کہ وہ کام ہو تم سے
میداں میں عاجز سپہِ شام ہو تم سے
سرسبز زمانے میں مرا نام ہو تم سے
حیدر کی طرح رونق اسلام ہو تم سے
پھر بیاہ ہو مہلت جو اجل اب کی برس دے
اللہ انہیں چھوٹی سی تلواروں میں جس نے

مختلف گھروں کا ماحول مختلف بچوں کے مزاج دیکھ کر انیس

نے اپنے کرداروں کو ہر ایک کے لئے مثالی بنایا ہے۔ ہر عمر ہر
صنف ہر معیار کے افراد کا انفرادی اور مجموعی تشخص واضح۔ کرنے کے
لئے مثالوں کی گنجائش نہیں ہے ورنہ انیس کے مرثیوں سے ایک
شجاعت آفریں دیوان مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اس تشخص کی بنیاد ہے:۔
عقیدۂ توحید۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اسلام سے محبت اپنے
شاندار روایات سے استفادہ اور بزرگوں کی مجاہدانہ تاریخ سے وابستگی
اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرنا، کافر پر بھروسہ نہ کرنا، حکومتِ باطل سے نہ
دبنا۔ حق کو حق کہنا چاہیے، جان چلی جائے ہمیشہ آگے بڑھتے رہنا اور مشکلات
برداشت کرنے کو تیار رہنا چاہیے۔

میر انیس نے دیکھا کہ جنگ کے بعد تیر و تلوار، نیزے اور گھوڑے عوام
کی نظر میں بے وقعت ہو گئے۔ انہوں نے بڑی سختی سے سپاہیانہ روش
کو سراہا، تلوار کی تعریف، گھوڑے کی تعریف، سپاہیانہ دھج کی تعریف اتنی
کی جس نے ان چیزوں کو محبوب بنا دیا۔ مجلس عزا میں چھوٹی بڑی لڑائیوں اور
آقا و غلام کے معرکوں کی اتنی تصویریں پیش کیں جن کی مثال دوسری جگہ نہیں مل سکتی
اس طرح انیس نے خونی معرکہ ختم ہونے کے بعد قوم کو آرام گاہ میں نہیں
سلایا۔ انہیں عیش و عشرت کی داستاں سنا کر غم دوراں سے آزادی نہیں بخشی۔
انہوں نے ایسی تاریخ اور ایسے فلسفے، ایسے المیے اور ایسے دینی واقعے کو
سامنے رکھنے کا فریضہ انجام دیا جس نے قوم کو ہمیشہ زندگی سے مالا مال کیا
ہے۔ واقعہ کربلا جس طرح دائمی فتح کی علامت ہے اسی طرح اس واقعہ
کے جزئیات ایمان اخلاق اور انسانیت کے اعلیٰ اقدار، بہادری اور جاں
نثاری، پھر شہادت طلبی کے پیغام کے بہترین ترجمان بھی ہیں۔

انیس نے اپنے مرثیوں میں مرد مومن، مجاہد، شہید، خود آگاہ، فاتح
زمانہ جیسے تصورات و حقائق کو غیر فلسفیانہ زبان میں سمجھایا اور مثالوں سے ثبوت

فراہم کیا ہے۔ لطف یہ ہے بغاوت، خوں ریزی کے لئے یلغار، خوں آشامی کے لئے جنگ اور غواہ مخواہ کا اشتعال نام کو نہیں ملتا۔ جہاں جہاں یہ صورت ہوگی وہاں وہاں جنگ اسلامی انداز اور اسلام دشمن افراد نظر آئیں گے۔ لیکن مجاہدان خوش کردار اور غازیان بلند صفات اور شہیدان عالی درجات حملہ آور کے ہر حملے کا سخت ترین جواب دینے کیلئے ہر وقت تیار پائے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر انیس کے مرثیے ایک صدی سے ہزاروں افراد پڑھتے سنتے چلے آرہے ہیں۔ اور اثر میں فرق نہیں ہوتا اس طرح انیس کی یہ دعا پوری ہو چکی ہے۔

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے ہی قلم رو سے نہ جائے

مرثیے کی مجلس میں ہندو مسلمان، امیر غریب سب شریک ہوتے اور ان کے پیغام سنتے اور اثر لیتے تھے۔ انیس کے مرثیے پر تنقید کرنے والوں نے سب کچھ کہا۔ مگر اسے ہمت آفریں، اخلاق آموز اور کلاسیکی ماننے میں تکلف نہیں کیا۔ چکبست ہوں یا حالی دونوں نے انیس ہی کے انداز میں اپنی اپنی بات کہی مگر ایک کو تو مواد نہ مل سکا دوسرے تاریخ کے طویل دفتر میں چلے گئے جس سے قوم کو بھولی داستان یاد دلائی۔ مگر اس سے گرمانے کے بجائے رلانے کا کام لیا۔ اس کے ردعمل نے علامہ اقبال سے شکوہ لکھوایا شبلی نے بھی تاریخی سہارے لے کر انیس کے لہجے میں قوم سے کچھ کہنا چاہا مگر انیس کی تاثیر آفرینی، انیس کا فکری پھیلاؤ، انیس کا شعور، انیس کا اقتدار اور انیس جیسا ضخیم و طویل دفتر کسی کو نہ مل سکا۔ انیس نے اسلامی شخصیتوں اور اسلامی واقعہ میں مشہور واقعۂ حق و صداقت یعنی المیۂ کربلا کو موضوع بنایا۔ اس واقعہ سے قومی تشخص اور نظریۂ حیات کو خود بھی دریافت کیا اور دوسروں کو بھی سمجھایا۔ پھر اسے فلسفہ کے بھاری پن، اسلوب کی خشکی، خطابت کی جذباتیت اور وعظ کی کیفیت سے دور

رکھ کر چھوٹے چھوٹے قصوں، متوسط حکایتوں اور قدرے طویل محاکاتی پیرایوں میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو فلسفی خطیب یا قومی رہنما کہہ سکتا تھا پھر اسے فضائل و مصائب، ذاکری اور مرثیہ خوانی کی حدوں سے بھی نہ نکلنے دیا۔ اعلیٰ ادبی معیار، بلند ترین فنی درجہ اور رنگا رنگ اسالیب شعری کو پوری طرح ملحوظ رکھا۔ اب جو چاہے مرثیہ کو رونے رلانے کے لئے پڑھے جو چاہے وہ انیس کا مرثیہ روایتی ادب اور جدید شاعری کے زاویے سے دیکھے۔ میں نے تو انیس کو قومی تحریک میں قومی تشخص کا نقیب پایا ہے مسلمانوں کے زوال آمادہ معاشرے سے عملی ہمدردی اور قوم کو رونے اور سونے کا مشورہ دینے کے بجائے انیس کو جنگ جنگ کہتے سنا ہے واضح طور پر نظر آتا ہے کہ انیس ہر وقت علاج کے ساز و سامان سے لیس ہو کر آئے اور قوم کو آہستہ آہستہ توانائی اخلاق و صفات اور انفرادی و اجتماعی سربلندی و تشخص کے کارزار میں لے کر آگے بڑھ گئے۔ ان کی جدت، ان کا نعرہ ان کا پیام جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا۔ اچھے نتائج حاصل ہوتے گئے انیس نے طاؤس و رباب کے بجائے شمشیر و سناں سے قوم کو اتنا مانوس کیا کہ:۔

نیزوں کو عصا تیغوں کو پل کر دیا اس نے
آتش کو چمن خار کو گل کر دیا اس نے

۲۶ر اگست ۱۹۷۴ء

انیس کا مطالعہ کیوں کیا جائے

اردو ادب کے رنگارنگ اصنافِ سخن میں مرثیہ کو وہ مرتبہ حاصل ہے۔ جس کے مقابلے میں سارا ذخیرہ شعر سبک ہے۔ سخت سے سخت انتقاد کڑی سے کڑی تنقید کے باوجود فنی کسوٹی پر مرثیہ رزم و بزم، جذبات، واقعات، فطرت نگاری بلند نگاہی، تمثال کاری، جرائت آفرینی، دردانگیزی میں مجموعی طور پر بے عیب ہے

قطب شاہ کے مراثی بین مرثیت اور محاکات کے اعلیٰ مرتبہ پر ہوں یا نہ ہوں۔ ولی دکنی میر تقی میر، مرزا رفیع سودا، ضمیر، دبیر، انیس تک جو فن ہمارے سامنے آیا اس میں رزمیہ شاعری کے تمام عناصر جمع ہو گئے۔ اگر کوئی شخص اردو کی رزمیہ شاعری اور ادب اردو کی فنی چھان بین کرے تو اسے مشرق میں ایک ایسی روایت ملے گی۔ جس کی نظیر عربی، فارسی، ہندی میں ملنا مشکل ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ اور ہندی کی "الھا اودل" کا مرثیہ سے توازن درست نہیں

ہر زبان میں شاعری جذباتِ غم کی ترجمان ہے یا احساسات شجاعت کی۔ ترجمانی غم میں عشق اور بیان شجاعت میں رزمیہ عنوانات قائم کئے جاتے ہیں۔ عشقیہ میں غزل، واسوخت یا وقار و مصنوعی اظہار محبت میں قصیدہ شجاعانہ یا حماسی شاعری میں السلام کھنڈ، کسی فاتح کے کارناموں کا سکندر نامہ یا

شاہ نامہ قصیدہ یا مثنوی فارسی و اردو کا طرۂ امتیاز ہے اس لئے کہ بہت سی زبانوں میں اتنی طویل نظمیں نہیں ہیں۔

"مرثیہ" آغاز بنائے لفظ سے جذبات غم کی شدت اظہار سے عبارت ہے۔ محبوب کی موت چاہنے والے کی وفات عزیز کے انتقال پر جو المیہ اور ہنیہ اور اشعار نظم کیے جائیں انہیں مرثیہ کہا جاتا ہے۔ ہماری ہزار سالہ تاریخ ادب میں عربی مراثی کے دفتر موجود ہیں۔ فارسی و اردو میں بھی آج تک صدہا مراثی چھپ چکے ہیں۔ لیکن ضمیر و خلیق کے عہد سے اب تک لفظ، "مرثیہ" جن اصطلاحی معنوں میں مستعمل ہے۔ وہ مشرقی ادب میں بالکل نئی چیز ہے۔

وہ مسدس جو واقعات کربلا پر رونے رلانے کے لئے، لکھا جائے اور کم از کم چہرہ، گریز، سراپا جنگ اور بین یا شہادت کے بیان پر مشتمل ہو:-

ان معنوں کی رعایت سے نوحہ، ماتم اور عام مرثیہ۔ ہمارے نزدیک مرثیہ نہیں ہے اگرچہ عام مرثیہ کو مجازاً مرثیہ کہا جاتا ہے لیکن نقد و ادب میں نہ اسے موضوع بنایا گیا ہے نہ اس پر فنی توجہ دی گئی ہے۔ دکن کے قدیم مراثی اور سودا و میر تک کے کربلائی منظومات کو مرثیۂ حقیقی اس لئے قرار دیا جاتا ہے۔ کہ اس میں موضوع اور مقصد پایا جاتا ہے۔ واقعات کربلا پر رونا اور رلانا۔ وہ بھی عوام صی، نوری، وغیرہ کے مراثی اسی قسم کے منظومات ہیں۔ بلکہ بعض مخمس مرثیے بہادر شاہ ظفر نے بھی لکھے جنہیں میں نے اپنے ایک مقالے میں نوحہ کے نام سے یاد کیا ہے

(دیکھیے میری مطبوعہ تصنیف تاریخ عزاداری)

مرثیہ در حقیقت جس موضوع سے سہارا لیتا ہے وہ اس قدر جاندار حیات آفرین و درد انگیز ہے کہ اسلام، اخلاق

حریت غرض تمام زندہ قدریں اسی سے حیاتِ نو حاصل کرتی ہیں۔ جن شعرا نے یہ راز پا لیا وہ زندۂ جاوید ہو گئے دنیا میں دار و رسن کی آزمائشیں ہوتی رہیں گی مگر منصور سے لے کر آج تک "دار" کسے نصیب؟ معرکے روز ہوتے ہیں مگر معرکۂ کربلا جیسی ہمہ گیری و دلکشی کسے میسر؟

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا،
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

یک حسینے نیست کو گردد شہید
ورنہ بسیار اند در عالم یزید

اسلام ایک زندہ حقیقت ہے۔ حسینؑ اس حقیقت کی حقیقت ابدی، مسلمان کو حسینؑ پیارے ہیں۔ اس پیار نے واقعۂ کربلا کی تبلیغ کی اور اب یہ عالم ہے کہ

اک فخر سا محسوس ہمیں ہوتا ہے
جب کوئی یہ کہتا ہے ہمارے ہیں حسینؑ

محرم ۶۱ھ تک، اولادِ رسول صلعم پر بے گھری، مسافری کس مپرسی، بیاباں نوردی کی انتہا ہو گئی۔ یکم محرم سے دس محرم تک خون، پیاس، قتل، تباہی، گرفتاری نے وہ منظر دکھائے کہ

کانپے طبق زمیں کے، ہلا چرخِ لاجورد
مانند کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
اٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلے میں گرد
تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد

گرمی سے ان کے ہوش اڑے وحش و طیر کے
شیر اُس طرف اتر گئے دریا کو پیر کے

ایک دن کی لڑائی بھی کوئی لڑائی ہے ستر بہتر سپاہیوں کی تیغ آزمائی بھوکوں پیاسوں کی میدان آرائی تو یہی ہونا چاہئے تھی۔ کہ آتے، تیورا کے گرتے تڑپ کر جان دے دیتے۔ لاکھوں دشمنوں میں اسلام کے یہ جان نثار فرزند، جگر گوشۂ نبوت امام حسین علیہ السلام کے سایۂ وقار میں کھڑے جھوم رہے تھے۔ چہروں پر خوشی و کامرانی سے سرخی، چتونوں پر بل، بازوؤں میں تڑپ، سینوں میں ولولے تھے اور دشمن کا عالم یہ تھا۔

امڈی ہوئی تھی، فوج پہ فوج اور دل پہ دل
تھے برچھیوں کے صورتِ مقراض پھل پہ پھل
خنجر وہ جن کی آب میں تھی تلخی اجل
وہ گرز جن کے ڈر سے گرے دیو منہ کے بل
دو دو تبر تھے پاس ہر اک خود پسند کے
حلقوں پہ تھے بچھے ہوئے حلقے کمند کے

انصار حسینی کا یہ عالم کہ:۔

تنتا ہوا بڑھا کوئی قبضے کو چوم کے
بھالا کسی نے رکھ لیا کندھے پہ جھوم کے
دو لاکھ سے نظر کسی غازی کی لڑ گئی،
بل کھا کے زلف رخ پہ کسی کے اکڑ گئی،
چتونوں کسی کی شورِ جدل سے بگڑ گئی
منہ سرخ ہو گیا شکن ابرو پہ پڑ گئی

نکلا کوئی سمند کو زانو میں داب کے
غصے سے رہ گیا کوئی ہونٹوں کو چاب کے
بڑھ کر کسی نے تیر ملایا کمان سے
نیزہ کوئی ہلانے لگا آن بان سے،
نعرہ کسی کا پار ہوا آسمان سے،
تلوار کھینچ لی کسی صفدر نے میان سے
اک شور تھا کہ تلخ کیا ہے حیات کو
لاشوں سے چل کے پاٹ دو نہر فرات کو
سنتے ہی یہ کلام جوانانِ نام ور
لڑ کے الگ کھڑے ہوئے غول اپنا باندھ کر
کہتے تھے نیچے لئے وہ غیرتِ قمر
اللہ شکست کو عدوں کو دے اور ہمیں ظفر
مر کے نہ پھیرو غازیو جو بڑھ کر قدم گڑے
جا کر در یزید پہ اپنا علم گڑے

مر دیا ہر بچے اور عورتیں خیموں کے اندر یزید کا لشکر نہر فرات سے لے کر حد نظر تک گھیرا ڈالے ہوئے تھا۔ صبح کی نماز سے عصر تک غازی شہید ہو گئے اور سید الشہداء امام حسین علیہ السلام بھی دادِ صبر و شجاعت لے کر اللہ کے حضور میں تشریف لے گئے۔ شہزادیاں گرفتار فوج یزید ہو کر کوفے سے شام کے دربار اور پھر حکم یزید سے قید خانے میں داخل کی گئیں:۔

مظالم کی اس انتہا نے ایک دنیا کو ماتم زدہ، ایک جہان کو نوحہ خواں کر دیا۔ انیس اس غم کے ترجمان ہیں۔ مگر رونے رلانے کے ساتھ ساتھ صالح جذبات کو پرورش دیتے

ہوئے قومی شعور، انسانی تقاضوں اور ترقی یافتہ قدروں کو للکارتے ہوئے۔

ہومر اور شکسپیر۔ فردوسی و نظامی کے موضوع بدلتے رہتے ہیں یا فن اور تکنیک بدل جاتی ہے۔ انہوں نے ایجادِ مضامین کے دریا بہا دیے۔ ایک مقررہ مضمون کو سیکڑوں مرثیوں میں خوب سے خوب تر ادا کیا۔ ہر مرثیہ کا چہرہ نیا۔ آمد نئی، رزم جدا بزم جدا، اور ہر میدان میں مضمون اچھوتا، تلوار نئی، نیزہ نیا، گھوڑا نیا، انداز نیا، مقابلہ نیا، اور اس پر کیا منحصر ہے۔ صبح کا عالم، دیکھو تو سبحان اللہ، رات کی رخصت، سیاہی کا پھٹنا، نور کا ظہور، آفتاب کا طلوع، مرغزار کی بہار۔ شام ہے تو شام غریباں کی اداسی، کبھی رات کا سناٹا، کبھی تاروں کی چھاؤں کو چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ ساتھ رنگ رنگ سے دکھایا ہے۔ (آبِ حیات ص ۵۴۳)

جوانوں کے جذبات شجاعت، بوڑھوں کا استقلال، بچوں کی جاں فروشی، مقصد کا پیرجار، شہادت کا شوق، عبادت کا ذوق، پیش قدمیوں کی تعریف، لڑنے مرنے کی کیفیت موت و زیست سے بلند ہونے کا ناز، خوفِ خدا۔ احساسِ بندگی کا اظہار ——— جنگ کو کھیل، اور کھیل کو کارنامۂ جاوداں بنا دینے کا پس منظر مرثیہ کے علاوہ کہیں نہ ملے گا:۔

امداد امام اثر کی رائے ہے:۔

ورجل جو ہومر کا متبع ہے۔ میر صاحب کا ہرگز ہم پایہ نہیں قرار دیا جا سکتا اور نہ اس ہم پائیگی کا استحقاق فردوسی کو حاصل ہے:۔

میر صاحب کو فردوسی ہند کہنا بے شک میر صاحب کی ایک بڑی ہی

نا قدر شناسی ہے...... میری دانست میں ہومر ایک بڑا رزمی شاعر تھا۔ لیکن اگر ہومر سیر تھا تو میر صاحب سوا سیر تھے۔ اس افزونی کی وجہ یا یہ تھی کہ میر صاحب خود نفسِ قوت شاعری میں ہومر سے زیادہ تھے یا یہ کہ میر صاحب کو سبجکٹ (SUBJECT) یعنی شاعری کا موضوع ایک ایسا بزرگ ہاتھ لگا ہے جس کا جواب دنیا میں نظر نہیں آتا اس واقعہ عظیم کے ساتھ واقعے (ٹرائے) کو کوئی نسبت نہیں ہے۔ شاہزادہ ٹرائی کا قصہ ایک ناپاک قصہ ہے اور ہر گونہ قابل نفریں ہے۔ یہ ہومر ہی کی قابلیت شاعری تھی جس نے اسے قابلِ توجہ بنا دیا ہے۔ ورنہ شاہزادہ ٹرائے کے قصے میں کوئی ایسی عظمت کی بات نہیں پائی جاتی ہے۔ جس کی طرف اہلِ مذاق کو کسی طرح کی رغبت خاص پیدا ہو سکے۔ برخلاف اس کے کربلا کا معاملہ ہے کہ نہایت اعلیٰ درجے کے امور دین و اخلاق امور تدبیر المنزل اور امور سیاست مدن پر مشتمل ہے سارے ایسے معاملات کی طرف توجہ کرنا ہر دین دار، ہر ذی علم ہر حکیم اور فلسفی کا کام ہے۔ یہ واقعہ معاملات عالم کی تمام خوبیوں کا خلاصہ ہے پس کچھ تعجب نہیں اگر میر صاحب کی شاعری کو اس طرح کے ارفع مضامین نے ایک بے قیاس مدد دی ہے، جس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک عمدہ سبجکٹ کے دستیاب ہونے سے میر صاحب ہومر سے سوا سیر معلوم ہوتے ہیں۔

یہ امر میر صاحب کے مرجح سمجھے جانے کا ایک بڑا سبب دکھائی دیتا ہے مگر نفس شاعری کے اعتبار سے بھی راقم کی دانست میں میر صاحب کی کیریکٹر نگاری اس سے بڑھی معلوم ہوتی ہے

(کاشف الحقائق ج ۲ ص ۷۷، ۴)

سینکڑوں مرثیوں کا لکھنا۔ کامیاب رزمیوں کی تخلیق ۔۔ زبان و بیان کی گہرائی ۔ لوچ ۔ سختی ۔ گرمی لطافت کے کتنے اقتدار کس قدر تجربے چاہتا ہے؟ اسے ایک عالمی ادب کا ماہر یا لسانیات کا محقق ہی سمجھ سکتا ہے ۔

لکھنؤ نے زبان و بیان کو سلامت و روانی بخشی دہلی نے اسے درد و وسعت عطا کی ۔ میر انیس ۔ میر تقی میر ۔ مرزا محمد رفیع سودا ۔ میر حسن کے بعد آرزو ۔ حاتم و ناسخ کے فیض سے متاثر ہو کر ضمیر ۔ مسکین ۔ خلیق کے عہد میں دبیر کے حریف بنے ۔ اس پس منظر نے ان کی طبیعت خداداد کو جلا بخشی ۔ اور انہوں نے مضامین کے انبار زبان کو وسعت و آفاقیت فن کو خیابانِ ساحل دیا

مشاہدات کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے فلسفہ و سائنس کے کلیے ، نفسیات و طب کے قوانین مرتب ہوتے ہیں ۔ قرآن مجید نے آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری پر غور کرنے کو معرفت خدا کا ذریعہ قرار دیا ہے

انیس اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے بلا کی سادگی ، اور قیامت کی روانی ، غضب کے تخیل اور بے مثال لطافت سے متحرک تصویریں کھینچی ہیں ۔ نظیر اکبر آبادی کا موضوع بازہ ہوتا ہے ۔ عوامی ہے ۔ اس کا فائدہ تفریح ہے ۔ انیس نے وقار ، مذہبی افادیت اور روحانی اعتبار اور زبان کے رکھ رکھاؤ کا خیال رکھ کر ہمارے ادب کو سربلند کیا صبح ، شام ، دوپہر ۔ گرمی ۔ سردی ۔ بہار ۔ جنگل ۔ باغ دریا ۔ ریگستان ۔ شہر ۔ ویرانے ۔ دربار ، قید خانہ ، جشن اور غم ہر چیز

کو لکھا۔ پھر موضوع پر شعر کہے۔ پھر یہ عالم کہ ذوق کو سرشاری
زبان کو کوثر و سلسبیل کی پاکیزگی ملتی اور نکھار ابھرتا چلا جاتا ہے

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے اَرِنی گوئے اوجِ طور
پیلیا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور
وہ جابجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور
گلشن خجل تھے وادی مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے
ٹھنڈی ہوائیں سبزہ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریِ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے
وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم،
کو کو کا شور نالۂ حق سرّہٗ کی دھوم
سبحانَ ربّنا کی صدا تھی علی العموم
جاری تھے وہ جو ان کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ربِّ علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی مدح
چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار
اے دانا کشِ ضعیفوں کے رازق ترے نثار

یا حیّ و یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار
تسبیح تھی کہیں، کہیں تہلیل کردگار
طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

اقتباسات کا دامن وسیع ہے۔ ادب کا طالب علم ان مناظر سے باخبر ہے۔ اساتذۂ فن نے اپنے دفتروں میں بہت کچھ لکھا ہے۔ میں صرف یہ عرض کروں گا کہ انیس کا مطالعہ زبان میں شستگی حسن، دیانت کا سبب ہے۔ اس سے مشاہدے کی قوت میں وسعت اور گہرائی حاصل ہوتی ہے۔ نفسیات کے نکتے اجاگر ہوتے ہیں۔ احساسات میں توازن و جوش آتا ہے۔ اسلامی تاریخ سے ربط اور مجاہدۂ کربلا کے لئے بصیرت۔ عکاسی، تصویر کشی کے ماہرانہ خطوط، ثقافت اور تاریخ کے واضح مجسمے تخیل و شاعری کے مثالی ارتقاء سمجھنے کے لئے مراثی انیس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اسلامی شاعری کا پہلا دفتر دیوان کلیات مراثی ہے۔ حالی اکبر، اقبال بہت بعد میں پیدا ہوئے۔ درحقیقت اگر اردو میں مراثی کا وجود نہ ہوتا تو ہمارا ذخیرۂ شعر بڑی حد تک دفتر بے معنی ہوتا۔ حالی اکبر۔ اور اقبال خالص اسلامی شاعر ہیں۔ ان کے فن میں مسلمان پہلا مخاطب ہے، اسلامی افکار و ثقافت پہلا موضوع ہے۔ وہ اسلام کے ذریعے انسانیت کو دعوت فکر و عمل دیتے ہیں۔ انیس کا موضوع اسلام ہے۔ لیکن انہوں نے انسانیت کو مخاطب کر کے اسلامی کردار کو دعوت کے طور پر پیش کیا۔ یہی سبب ہے کہ انہیں شیعہ سُنی، ہندو، عیسائی ہر ایک نے پسند کیا۔ اور نئی نسل نے

ان سے اثر لیا۔

مشرا ان۔ چکبست۔ سرشار۔ سری رام۔ سرسید و مہاراجہ کشن پرشاد۔ امن۔ حالی۔ شبلی۔ ذکاء اللہ۔ نورالحسن کاکوروی۔ آزاد سرعبدالقادر۔ امداد امام اثر۔ حامد حسن قادری۔ مسعود حسن ادیب۔ احتشام سرور۔ سید عبداللہ سے ایک طالب علم تک ہم زبان و یک رائے ہیں علامہ تاجور۔ اور مؤلف فکر انیس مسعود حسن ادیب مدظلہم نے انیس کے مرثیوں کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ منظر نگاری کے نقطۂ نظر سے انتخاب کیے رزمیہ کے طور پر مختلف مرثیوں کو مرتب کیا۔ شاہنامے کے انداز میں ترتیب دی جس کا مقصد ادب کی وسعتوں کا جائزہ لینا اور تعارف کرانا تھا۔ اس کے علاوہ اسلامی لٹریچر کی عظمت کا اظہار، اور متحدہ ہند میں مسلمانوں کی تعمیر ثقافت کا معمار بتانا بھی لکھنؤ کی وہ مشہور سالانہ مجلس جس میں انیس اور ان کے اخلاف نفیس عروج وفائز اپنا نو تصنیف مرثیہ پڑھا کرتے تھے میں نے دیکھی ہے۔ دل آرام کی بارہ دری میں وہ ثقہ معیاری اور بے مثال اجتماع دیکھا ہے۔ جو سو برس پہلے کی مجلس کا ایک ہلکا سا نمونہ تھا۔ میں نے ان ہندو مسلمان حضرات کو دیکھا ہے۔ جو اسلامی تہذیب میں رنگے ہوئے اشعار انیس کے حافظ تھے۔ ہم نے معتبر و مستند ہندو مسلمان ادیبوں (مثلاً کشن پرشاد کول) کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر انیس نہ ہوتے تو نئی شاعری کے لئے آزاد۔ حالی۔ چکبست اور کیفی کو بڑے ہمت شکن تجربے کرنا پڑتے اور شاید کامیابی نہ ہوتی۔ نظم طباطبائی۔ چکبست حالی اور آزاد کے منظومات کا مطالعہ کرنے والے بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب فیض انیس ہے۔ اقبال اور ان سے زیادہ جوش کی عظمت کا دار و مدار مراثی کے مطالعے پر ہے۔

اکبر الہ آبادی نے شیخ ممتاز حسین جونپوری کے سامنے ایک معیاری محفل میں کہا تھا کہ مراثی کا سننا پڑھنا اور انیس کے کلام پر غور کرنا ذوق شعر فہمی، نکتہ سنجی اور زبان شناسی کا فائدہ دیتا ہے:۔

فکرِ انیس مراثی انیس کا ایک انتخاب ہے۔ یہ انتخاب مؤلف کے ذوق و رجحان کے مطابق بہت اچھا ہے۔ مؤلف نے چاہا کہ مجالس کیلئے ایک ایسا مسلسل و مربوط منظومہ تیار ہو جائے جو انیس کے قلم سے ہو اور جو انیس کا مقصد تھا۔ اسی مقصد یعنے رونے رلانے کا فائدہ دے عام قاری اسے اپنے نقطۂ نظر سے اور طالب علم افادی نقطۂ نظر سے دیکھ کر بیحد محظوظ و مستفید ہو سکتا ہے۔ اس میں تعصب پراپیگنڈہ، چھیڑ چھاڑ کے بجائے انسانیت اخلاق اور خالص اسلامی قدروں کا دریا یم بہ یم ساحل بہ ساحل نظر آتا ہے۔

کاش کسی کا ذوق مراثی دبیرؔ کا بھی اسی طرح انتخاب کر کے خدا سے اجر اور ادب سے داد لے۔ میں اس سلسلے میں ایک مبسوط کام کرنا چاہتا ہوں۔ افسوس کہ مراثی دبیر یعنے دفترِ ماتم دستیاب نہیں ورنہ آسمان ادب کے ان دونوں آفتابوں، ماہتابوں کی نور افشانیوں کا عکس پیش کرتا ؎

کس دن فرس خامہ تگ و دو میں نہیں،
مجھ سا بھی سیہ بخت کوئی سو میں نہیں
ہر چند کہ ہوں خسروِ اقلیم سخن،
پر غیر دوات، کچھ قلم رو میں نہیں

(مقدمۂ فکر انیس مطبوعہ لاہور)

(انیس)

بے مثال خطیب بے مثال شاعر

انیسؔ

اردو کے اصناف سخن میں ایک صنف کا نام قطعہ ہے۔ قطعہ میں چند مربوط اشعار میں کوئی واقعہ یا تاثر نظم کیا جاتا ہے۔ اس میں لفظ و معنی کی ترتیب ... صوابدید پر موقوف ہوتی ہے۔

دوسری صنف شعر غزل، کو موتیوں کی لڑی کہنا چاہئے جیسے ہار میں ہر موتی کی ڈھلک اس کی قیمت، اس کا حسن الگ الگ بھی ہوتا ہے اور یکجا بھی اس طرح غزل کا ہر شعر الگ الگ بھی ہوتا ہے۔ اور مسلسل بھی۔ نہ ہار میں موتیوں کی تعداد مقرر ہے۔ نہ غزل میں اشعار کی گنتی۔ بس شرط یہ ہے کہ ہار ہار کہلائے۔ اور غزل اپنی حد سے آگے بڑھ کر مثنوی یا نظم نہ بن جائے۔ غزل میں زبان و بیاں کی گھلاوٹ، الفاظ و خیالات میں لوچ اور مٹھاس جذبہ و فکر میں کیف و اثر شرط ہے۔ ردیف و قافیہ ایک ہونا ضروری ہے۔

تیسری صنف شاعری قصیدہ ہے۔ یہ مشکل صنف ہے اس کے حدود اس کی ترکیب اس اکائی کے اجزا معین تھے۔ مثلاً

تشبیب :- یہ قصیدے کا آغاز ہے۔ شاعر کو اختیار ہوتا ہے کہ دن رات کا مناظرہ لکھے یا بہار و خزاں کی منظر نگاری فلسفہ و تاریخ کے حوالے دے یا رزم و بزم کے مناظر، انہیں میں ساقی نامہ بھی داخل ہے۔

گریز: تشبیب یعنی تمہید کے بعد شاعرانہ انداز میں نکتہ پیدا کر کے لطیف پیرائے اور خوبصورت طریقے سے مدح وستائش کی طرف آنا۔

مدح: یعنی ممدوح کی خوبیوں کا بیان۔ حسب۔ نسب کردار و صفات انعام و سخاوت جنگ اور انتقام جیسی شخصیت ہو اس کی مناسبت سے اوصاف و محاسن کا تذکرہ، اس میں تیر تلوار کمان نیزہ، ہاتھی، گھوڑا، موت، حیات ممدوح کی سپاہیانہ خوبیت امیر کا سراپا، اس کا سوار ہو کر میدان میں آنا۔ حریف کی حالت جنگ کا نقشہ یا بزم کی آرائش، داد و دہش کی بارش کو شاندار لفظوں میں سراہا جاتا ہے۔ حسن طلب اور دعا قصیدے کے آخری جز ہیں۔ غزل کی طرح قافیہ و ردیف کی یکسانیت اس کی فنی شرط ہے۔ انیس کے زمانے میں تعلیمی نصاب میں قصیدہ کو خاص اہمیت حاصل تھی، انوری، خاقانی، بدر چاچ، عرفی اور قاآنی کے قصیدے مکتب و مدرسے میں پڑھے جاتے تھے قصیدوں کی زبان عالمانہ اور علم بدیع و معانی و بیان کے اصولوں پر منضبط ہوتی تھی۔ قصیدہ جتنا وزنی ہوتا تھا اسی قدر اسے داد ملتی تھی۔ اس وقت مرزا سودا کا قصیدہ اردو میں مثالی تھا۔

مثنوی:- ایک طویل صنف سخن ہے۔ اس کے اشعار، ردیف قافیے میں یکساں نہیں ہوتے۔ اس کے اجزاء عموماً حمد و نعت و منقبت، تمہید و آغاز داستان، ساقی نامہ، واقعہ، خاتمہ پر مشتمل ہوتے تھے۔ مثنوی کا موضوع اور اس کی ترکیب، اس کی زبان اور اس کا مقصد شاعر کے اختیار میں تھا۔

اٹھارہویں صدی میں شاہنامہ، سکندر نامہ، لیلے مجنوں،

یوسف زلیخا اور حملۂ حیدری کا بڑا رواج تھا۔ منطق الطیر اور مثنوی معنوی بھی ایک حلقے میں بہت پسند کی جاتی تھیں۔ اردو کی مثنویوں میں، میر اثر کی، مثنوی خواب وخیال (.. میر تقی میر کی مثنوی شعلۂ شوق و دریائے عشق اور ان کے بعد سب سے زیادہ مشہور مثنوی سحرالبیان عہد انیس کی پسندیدہ مثنویاں
اس کے دادا نے سحرالبیان کے علاوہ متعدد مثنویاں لکھیں اور سب پسند کی گئیں:۔

مرثیہ: ایک مدت سے قطعہ وغزل، پھر مثنوی کے طرز پر لکھا جاتا رہا۔ آخر آخر میں اسے ترجیع بند اور چو مصرعہ کا انداز ملا۔ لیکن سودا کے زمانے میں اس کی وضع مسدس قرار پائی سودا، میر، جرأت، حسرت وغیرہ نے مسدس کی ہیئت میں طبع آزمائی کی۔ (دیکھئے میری کتاب یادداشت تذکرہ مرثیہ گویاں طبع شیخ مبارک علی لاہور)

انیس کے عہد تک مرثیہ مختلف مرحلوں سے گذر کر منزل متعین کر چکا تھا۔ گروہ در گروہ شاعر واقعہ کربلا کے لئے ایک ہی اسلوب پر لکھ رہے تھے۔ فرق صرف قدرت کلام اور قوت فن سے واضح ہوتا تھا۔ کچھ لوگ مرثیہ اس لئے کہتے تھے کہ ان کے کلیات میں تمام اصناف سخن کی گنتی پوری ہو جائے۔ کوئی عقیدت ومحبت سے لکھتا تھا۔ بعض حضرات نے اسے فن بنا لیا تھا جن لوگوں نے ذریعہ تحصیل ثواب اور کمال فن سمجھ کر مرثیہ کہا وہ نئے تجربوں سے بھی گذرے۔ انہوں نے ہیئت ترکیب اجزاء، وحدت، اظہار، ابلاغ اور نتائج پر غور بھی کیا اور حسب ضرورت اس میں تبدیلیاں بھی کیں۔

مرثیہ خاصے کی چیز تھا۔ اس میں عقیدت و تقدس بھی تھا اور ادبی وقار بھی۔ ایک خاص قسم، خاص ماحول اور خاص تقاضوں کے سامنے شاعر کو اپنا فنی درجہ پیش کرنے کا موقع ملتا تھا۔ رنگا رنگ مجمع اور مختلف سطح کے عوام و خواص شاعر کی زبان سے دیر تک اسے سنتے اور اچھے برے کا فیصلہ کرتے تھے۔ اس لئے مرثیہ کی روح لطیف و شفاف ہوتی گئی۔ اس میں پہلے درد اور تاثیر تھی۔ اب اس میں گہرائی، بلندی، وزن اور قوت پیدا ہوتی گئی۔ اگر اب تک مرثیہ قطعہ و مثنوی کی شکل میں تھا، تو اب اس نے قصیدہ کی شان حاصل کی۔ دبیر نے مسدس کی ہیئت میں سکندر نامہ اور قصائد خاقانی کا آہنگ شریک کیا مرثیہ اب تک اس چمک دمک سے خالی تھا۔

انیس کی طبع رسا اور فکر بلند نے اسی مسدس کو قصیدہ کا متوازن رنگ و آہنگ، غزل کا لطیف مزاج، مثنوی کی روانی اور پھیلاؤ، قطعہ کی بندش اور اکائی اور مرثیہ کا کرب و درد سلیقے سے جمع کر کے ایک گلدستۂ صد رنگ و یک خوشبو بنا دیا۔ انہوں نے مرثیہ کو دوسروں کے دلوں کا آئینہ اور اپنی فکر کا چمن تختہ بند کر دیا۔ یہیں سے ان کی انفرادیت ابھری۔ ان کی بڑائی سامنے آئی۔ وہ رزمیہ و بزمیہ المیہ و طربیہ کے عظیم شاعر مانے گئے۔ انہیں فردوسی و شکسپیر کے پیمانوں سے ناپا گیا۔ ان کا مرثیہ ایپک کہا جانے لگا۔ ان کا مرثیہ یونان سے ہندوستان تک کے متنوع ادب کی عینکوں سے دیکھنے کے قابل قرار پایا۔ انیس کے مرثیے نے اردو نظم کی بے پناہ وسعتوں کا جائزہ پیش کیا۔ اگر انیس نے صرف دو چار مرثیے اس قسم کے پیش کئے ہوتے تو ان کی انفرادیت اور عظمت

کے لئے کافی تھے۔ لیکن ایک سو اسی مرثیوں میں کم و بیش پچاس مرثیے ایسے منتخب کئے جا سکتے ہیں۔ جو بہترین ہیں اور ان میں پچاس کو امتیازی اور پچیس کو بے مثالی کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ان مرثیوں نے نئی شاہراہ بنائی اور نئی منزل تلاش کی۔

ان مرثیوں میں قصیدے کی رنگارنگی، تشبیب کی رعنائی، فکری و ادبی رکھ رکھاؤ نظر آتا ہے۔ ان میں گریز کی لطافت سراپا کی شگفتگی و پاکیزگی، تیور اور عزم و استقلال، اقدام و دعوت ہے۔ مدح میں حقیقت نمائی ہے۔ اور رجنگ میں واقعاتی سپاہیانہ مہارت و ہنروری ہے۔ مصوری، خیال آفرینی، نفسیات پر عبور اور بیان و مقصد کے اظہار میں حیرت انگیز اقتدار دکھائی دیتا ہے۔ انیس کے مرثیوں کو حماست، بہادری اور رزمیہ شاعری کا بہترین نمونہ مانا گیا ہے اور معاشرت، تمدن اور المیگری کا نقش لازوال بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ انیس رزم کے بڑے شاعر ہیں یا بزم کے؟ وہ طربیہ کے ماہر ہیں یا المیہ کے؟ یہ سوال غلط ہے ان کے مرثیے میں ہر دل کی بات، ہر مشاہدے کا عکس ہے ان کے تمام مرثیوں کو سامنے رکھ کر مثال دی جائے تو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ جیسے ہوائی جہاز سے کرۂ زمین کی رنگین تصویر ویسے ہی انیس کے مرثیوں کی کچھ جلدیں۔

اردو اصناف سخن میں جو کچھ الگ الگ ہے وہ سب کچھ انیس کے یہاں پورے حسن کے ساتھ، پوری رعنائی و زیبائی اور ایسے رچاؤ ایسے توازن کے ساتھ موجود ہے ہے ہر سطح کا قاری، ہر ذہن کا سامع، ہر نقطۂ نظر کا ناقد، ہر ذوق کا ادیب لطف، اثر اور فائدہ اٹھاتا ہے۔ ان کی زبان کا ایک

معیار، ان کے بیان کا خاص انداز، اِن کی تاثیر آفرینی کا ایک عالم ہے۔ مقصد کے اجمال و تفصیل اور وقت کے ماضی و مستقبل کا فرق ذہن میں رکھا جائے۔ تو انیس کا مطالعہ بہت فکر انگیز ہے اس سے غیر معمولی ادبی و فنی روشنی ملتی ہے۔

انیس نے پورے شعور اور مکمل تیاری سے لکھا اور جو کچھ لکھا، اسے اصول و ضوابط کا پابند رکھا۔ انیس نے اپنے مرثیہ کا مطالعہ کرنے کے لئے ضروری باتیں بتادی ہیں۔ انہوں نے اپنے فرزند میر عسکری رئیس کو مرثیہ کہہ کر دیا۔ اور ان کی زبان سے کہلوایا۔

نمک خوان تکلّم ہے فصاحت میری،
ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری،
شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری،
عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں،
پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں،

یعنی رئیس ابن انیس ابن خلیق ابن میر حسن ابن میر ضاحک۔ پانچ پشتیں ہوئیں۔ اس کے بعد آٹھویں بند سے اپنی شاعری اور مقصد کا تعارف کراتے ہیں۔

مبتدی ہوں مجھے توقیر عطا کر یا رب!
شوقِ مدّاحیٔ شبیرؑ عطا کر یا رب!
سنگ ہو موم وہ تقریر عطا کر یا رب!
نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یا رب!

جدّ و آبا کے سوا اور کی تقلید نہ ہو
لفظ مغلق نہ ہوں گنجلک نہ ہوں تعقید نہ ہو
وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہلِ شعور
ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے کہیں نور
غل ہو یہ ہے کششِ موقلم طرفہ وجود
صاف ہر رنگ سے ہے قدرتِ صانع کا ظہور
کوئی ناظر جو یہ نایاب نظیریں سمجھے
نقش ارژنگ کو کاواک لکیریں سمجھے

تصویر سازی و مرقع آفرینی کے اس اجمال کو مزید تفصیل سے دیکھئے:

قلمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ
شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ
خون برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفِ جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

تین مصرعوں میں بزم اور تین مصرعوں میں رزم کو مقصد و اظہار کا آئینہ بنا دیا ہے۔ دوسرے اور چھٹے مصرعے میں بزم و رزم کو متحرک دکھایا ہے۔ یہ کمالِ فن اور قدرتِ سخن کی لطیف جلوہ نمائی ہے۔

روزمرہ شرفا کا ہو، سلاست ہو وہی
لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی

سامعین جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی
یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہو وے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہو وے

زبانِ و بیان، جسم و روح فکر اور پیرائے کے بعد ایک اور توضیح ہے :-

بزم کا رنگ جدا، رزم کا میداں ہے جدا
یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامے کا عنواں ہے جدا
مختصر پڑھ کے رلا دینے کا ساماں ہے جدا
مزید یہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں، رِقت بھی ہو تعریف بھی ہو

شاعری کی جان اور مرثیہ کا موضوع ہے :

ماجرا صبحِ شہادت کا بیاں کرتا ہوں
رنج واندوہ و مصیبت کا بیاں کرتا ہوں
تشنہ کاموں کی عبادت کا بیاں کرتا ہوں
جاں نثاروں کی اطاعت کا بیاں کرتا ہوں
جن کا ہمتا نہیں اک ایک مصاحب ایسا
ایسے بندے نہ کبھی ہوں گے نہ صاحب ایسا

بے ہمتا انصار امام کا تذکرہ اور شہادت سید الشہداؑ کا ماجرا بذاتِ خود اتنی گہرائی اور گیرائی کا حامل ہے جس کی مثال تاریخ عالم میں ناپید ہے۔ واقعۂ کربلا صدیوں سے لکھا پڑھا جا رہا ہے کتنے انقلاب آئے، کیا کیا حادثے رونما ہوئے، لیکن کربلا

کے شہیدوں کا المیہ اپنی اسی اہمیت اور اثر آفرینی کے ساتھ
باقی ہے۔ مؤرخوں اور شاعروں نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا
اور اس واقعہ پر لکھ کر شہرت عام و بقاء دوام تک پہنچے۔ مگر
مگر روضۃ الشہداء اور مراثی انیس کا جواب نہیں۔

روضۃ الشہداء فارسی نظم و نثر سے مرکب کتاب ہے
دسویں صدی ہجری سے تیرہویں صدی تک اس کی مقبولیت
کا سبب یہ ہے کہ مدتوں سے برصغیر میں محرم کا مہینہ
روضہ خوانی، روضۃ الشہدا نامی کتاب پڑھنے کا زمانہ تھا
جب لوگوں نے فارسی کتب کو چھوڑا تو اس کے
نظم و نثر میں ترجمے ہونے لگے پنجابی، سندھی، گجراتی اور دکھنی
میں اس کے تراجم اور اس نمونوں پر بہت کام ہوا۔ اردو
زبان میں اس کے تتبع اور اس سے مستفاد کتاب کا نام ہے
کربل کتھا ہے شمالی ہند میں اس کتاب سے اردو نثر کا آغاز ہوا۔
کربل کتھا ہے جس کے مؤلف و مصنف ملا فضلی عالم فاضل آدمی تھے
ان کی عبارت عربی فارسی الفاظ قرآن و حدیث کے تلمیحات و
استعمال سے وزنی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجلس کا
تقاضا اور مجلس کی روایت کس لہجے، کس تیور، کس زبان و بیان
کی عادی تھی۔ کربل کتھا کے بعد بہت سی کتابوں میں سے ایک
کتاب گلِ مغفرت ہے۔ حیدر بخش حیدری نے یہ کتاب انہی
مقاصد کے لئے لکھی جن کے لئے کربل کتھا لکھی گئی تھی۔
میں نے ان دونوں کتابوں کے مطالعے سے دریافت کیا کہ
مرزا دبیر دہلی کی مناسبت، علمی متانت اور دوسرے ذہنی
رشتوں کی بنا پر دراصل فضلی کے دبستان اور میر حسن کے

ماحول کی یکسانیت کے ترجمان تھے۔ اس کے نتیجے میں انیس، حیدری جیسی سادگی پسند کرتے ہیں۔ انیس ایسے مجمع میں بات کہتے تھے۔ جو نثر میں وہ مجلس، روضۃ الشہداء اور شہادت نامہ واقعات ملاخطا یا علماء کے وعظ سنا کرتے تھے۔ لہٰذا ان کے مرثیوں میں خطیب کا جوش شاعر کا ہوش بن کر نیا امتزاج پاتا ہے۔ وہ عام ڈگر سے ہٹے اور نئے طرز سے مرثیہ لکھنے بیٹھے۔ بدلے ہوئے حالات اور شاعرانہ بصیرت نے انیس کو ایسی بلندی پر پہنچا دیا کہ وہ ماضی اور مستقبل کے نقیب بن گئے۔ اور ان کا ہر فقرہ قدیم و جدید، مشرق و مغرب، خالص ادیب اور عام آدمی کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ آپ اسے خود پڑھیں تو آہستہ آہستہ اپنے لہجہ میں تبدیلی، اپنے ذہن میں اتار چڑھاو، اپنے دل میں جوش اور درد محسوس کرنے لگیں گے۔ کوئی دوسرا پڑھ رہا ہو تو آپ سننے کے لئے رک جائیں گے اور اغولیں گے۔ یعنی انیس کا مرثیہ منبر سے سنا جائے یا مطالعہ کی میز پر دیکھا جائے دونوں میں لطف ولذت، اثر اور کیفیت درد اور گریہ کا طاری ہونا لازمی بات ہے۔

دراصل انیس ایسا شاعر ہے جو خطیب ہے۔ اور ایسا خطیب ہے جسے سامعین کے مستقل اور غیر مستقل رجحانات و نفسیات کا پوری طرح علم ہے۔ آپ نے آمد، رجز، تلوار گھوڑا۔ بلکہ صبح و شام پر انیس کے بند پڑھے ہوں گے۔ میں اس کا حوالہ دے کر ایک خطیبانہ انداز پیش کرتا ہوں مرثیہ کا آغاز ہے اور ایک بات شروع کرتے ہیں:۔

غل ہے اعدا ہیں کہ زینبؑ کے پسر آتے ہیں
شور ہے بحر شجاعت کے گہر آتے ہیں

آفتابِ فلکِ فتح و ظفر آتے ہیں،
لاکھ سے لڑنے کو دو تشنہ جگر آتے ہیں
آج خلعت ہمیں لینا ہے سرافرازی کا
ہاں، جوانو! یہی ہنگام ہے جانبازی کا
وقتِ غفلت نہیں اے غازیو ہشیار رہو
کھینچ لو تیغ کو خوں ریزی کو تیار رہو
آمد آمد ہے دلیروں کی خبردار رہو
صف جمائے ہوئے آمادۂ پیکار رہو
کچھ کماندار، تو کچھ برچھیوں والے جاویں
اور دریا پہ، سواروں کے رسالے جاویں
اے علم دارو! نشانوں کے پھریرے کھولو!
ہاں کماں دارو! سواروں کے تم آگے ہو لو!
برچھیاں ہاتھوں میں تم برچھیوں والے لے لو
سرکشو جنگ تم حاکم سے جو چاہو سو لو!
غلغلہ دور تک اس عالم جرّار کا ہے
امتحاں آج دلیرانِ نمودار کا ہے
دیکھیں خوں پیاسوں کا کون آج بہا دیتا ہے
کون ہنگام وغا جان لڑا دیتا ہے
برچھیاں کون کلیجوں میں چبھا دیتا ہے
کون انہیں مار کے گھوڑوں سے گرا دیتا ہے
آج سر ہوتی ہے کس سے یہ لڑائی دیکھیں
لوٹتا کون ہے زینب کی کمائی دیکھیں

سنتے ہیں سن تو ہیں چھوٹے پر نہایت ہیں جری
کر چکے ہیں انہیں تعلیم وغا سبطِ نبیؐ
کس طرح ان سے بھلا ہوئے گا سر بر کوئی
پوتے جعفر کے ہیں یہ اور ہیں سبطینِ علیؑ
ان میں جوہر اسد اللہ کی شمشیر کا ہے
دونوں شیروں میں اثر فاطمہؑ کے شیر کا ہے

اسی مجمع کے سامنے ایک اور تقریر کی جاتی ہے :-

مہمیز کر کے اسپ کو آگے بڑھے امام
اعدا سے اس طرح لفصاحت کیئے کلام
اے سرکشانِ کوفہ و روم و عراق و شام
کوئی بھی کاٹتا ہے گلا بے گناہ کا؟
میں کون ہوں جناب رسالتؐ پناہ کا؟
کس کے پدر کا نام جناب امیرؑ ہے؟
کس کا پدر رسولؐ خدا کا وزیر ہے؟
وہ کون ہے جو صاحب تاج و سریر ہے؟
کون و مکاں میں کون شیر و نذیر ہے؟
بنیادِ کفر کس نے جہاں سے مٹائی ہے؟
کس نے نبیؐ کے دوش پہ معراج پائی ہے؟
پیدا ہوا جب کعبے کے اندر وہ کون ہے؟
چیرا ہے جس نے جہد میں اژدر وہ کون ہے؟
اتری جسے یہ تیغ دو پیکر وہ کون ہے؟
توڑا ہے جس نے قلعہ خیبر وہ کون ہے؟

سب کافروں کو کس نے مطیعِ خدا کیا؟
باطل کو کس کی تیغ نے حق سے جدا کیا؟
زور آورانِ خلق کو کس نے کیا ہے زیر؟
دونوں جہاں میں کون علیؑ سا ہوا دلیر؟
کہتی ہے کس کو خلقِ دو عالم خدا کا شیر؟
بھوکے کو کس ولی نے کیا تین روز سیر؟
کس کی سخا کا غل ہے عراق و حجاز میں؟
سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں؟
حق نے کیا عطا یہ عطا، ھَلْ اَتٰی، کسے؟
حاصل ہوا ہے مرتبۂ لَا فَتٰی کسے؟
دنیا میں کون منتظمِ کائنات ہے؟
کس کو کہا خدا نے کہ یہ میرا ہاتھ ہے؟
غیر از علیؑ ملا شرف صادقین، کسے؟
ہاتھ آیا زورِ دستِ جہاں آفریں کسے؟
یٰسین میں کہا ہے امامِ مبیں، کسے؟
حق نے کیا ہے راز کا اپنے امیں کسے؟
کس کو کہا ہے منذر و ہادی جہان میں؟
نصِ مباہلہ ہے کہو کس کی شان میں؟

دس بارہ بند اسی تسلسل سے لکھتے ہوئے کہتے ہیں:-

میں پارہ جگر ہوں بشیر و نذیر کا!
میں نور ہوں جہاں میں سراجِ منیر کا
ہے مجھ میں علم و فضل جنابِ امیرؑ کا
واللہ پیشوا ہوں صغیر و کبیر کا

اس میں بھی مصلحت ہے جو مظلوم آج ہوں
شاہوں کا شاہ ہوں سرِ عالم کا تاج ہوں
وہ کس کی والدہ ہے جو ہے بضعۃ الرسولؐ
راضیہ و رضیہ و صدیقہ و بتولؑ
مریمؑ کی عرض ہوتی تھی جس طرح سے قبول
فضّہ کے واسطے ہے وہی مرتبہ حصول،
عزت یہ فاطمہؑ کی کنیزی میں پائی ہے
اس کے لئے بھی نعمتِ فردوس آئی ہے

خطابت میں استدلال اور بیان میں زور آپ نے دیکھا۔ اب جوابی تقریر سنئے:-

اعدا نے تب کہا کہ یہ سب ہم پہ ہے عیاں
بے شک ہو تم نبیرۂ پیغمبرؐ زماں
حیدرؑ تمہارے باپ ہیں اور فاطمہؑ ہے ماں
بیعت بغیر یہ نہ ملے گی تمہیں اماں
مانیں گے فاطمہؑ کو نہ شیرِ الٰہ کو
کاٹیں گے بوسہ گاہ رسالتؐ پناہ کو

تقریر اور سوال و جواب، یا ہی گفتگو، بحث کی مثالوں سے مضمون کو طول دینا مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ غور کرتے چلیں کہ انیس خطابت کے اتار چڑھاؤ اور انسانی جذبات کے جزر و مد ہی نہیں جانتے۔ وہ حرکت اور سکون کے ترجمان اور تازک سے نازک جاندار اور بے جان کی نفیس ترین تصویر میں جان ڈال دیتے ہیں اور ہر چیز بولنے لگتی ہے:-

وہ چاند سے ماتھے وہ قبائیں وہ عبائیں
تسبیحیں تو ہاتھوں میں، زبانوں پہ دعائیں
تن پھول سے غنچوں کی طرح تنگ قبائیں
بس جائے وہ سب راہ یہ جس راہ سے جائیں
نورِ مہِ کامل کبھی سینے کو نہ پہنچے،
بُو ایسی کہ عطر اُن کے پسینے کو نہ پہنچے
کس شان سے شملوں کے سرے دوش پہ چھوڑے
وہ رعب، وہ اقبال، وہ ہتھیار، وہ گھوڑے
تیغیں بھی جو برسیں تو کبھی منہ کو نہ موڑے
اک ایک جری شیر کے پنجے کو مروڑے
برباد کریں کوہ کو، یاموں کو الٹ دیں
خیبر کی طرح قلعۂ گمرہوں کو الٹ دیں
چلتے تھے سواری میں جلال و حشم آگے
پیچھے تو محمدؐ کا نشاں تھا، علم آگے
جنت کے پھریرے سے ہوا آتی تھی ان میں
طوبیٰ نے جگہ پائی تھی زہراؑ کے چمن میں
ان متحرک اور جانداروں کے بعد صحرا اور جنگل کا حال دیکھیے
جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں
تھراتی تھیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں
دھڑکا تھا کہ دہشت سے نہ جانیں کہیں جائیں
روتی تھی کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں
گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچے

اور صحرا کے بعد ایک شکستہ قید خانے کی تصویر دیکھیے -

تاریکی ہے ایسی کہ برابر ہی ہے دن رات
اک قبر ہیں ہم لوگ بسر کرتے ہیں اوقات
حجرہ ہے ہر اک مسکنِ آفات و بلایات
یاں کون کرے گا زنِ حاکم کی مدارات
مسند ہے نہ تکیہ ہے نہ ہموار زمیں ہے
مٹی میں اٹا کوئی کہیں کوئی کہیں ہے
دالان کی چھت سے ہے زبس خاک فشانی
دل قیدیوں کے ڈر سے ہوئے جاتے ہیں پانی
کہتا ہے ہر ایک ہے آزار رسانی ،
قیدی کا اگر اک دم ہے تو سو دشمن جانی ،
جانیں جو اسیروں کی یہاں جاتی ہیں اکثر
راتوں کو صدائیں بھی مہیب آتی ہیں اکثر
بوسیدہ چھتوں میں ہیں لٹکتے ہوئے جالے
ایستادہ ہیں ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو سنبھالے
دیواریں بھی سب کائی ہیں روزن بھی ہیں کالے
افعی بھی ہیں روزن سے نہ بالوں کو نکالے
ہر سو یہ گھر مسکن آسیب و بلا ہے
نے شمع جلی ہے نہ چراغ اس میں جلا ہے

اب اسی شام کے دوسرے مکان کی تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ ہو -

یہ کہہ کے اس نے فرش کیا گھر میں سر بسر
مومن کے دل کی طرح مصفا ہوا وہ گھر
مسند بچھائی بہر شہنشاہ بحر و بر
تکیوں کو صاف کر کے لگایا ادھر ادھر

کہتی تھی میرے گھر میں ابھی جو نور ہے
یہ آمد امام زمن کا ظہور ہے
دالان ہے یہ شاہ کی خواہر کے واسطے
یہ نرم فرش ہے علی اکبر کے واسطے
جھولے کی جا ہے یہ علی اصغر کے واسطے
یہ گھر ہے شاہ دیں کے برادر کے واسطے
راحت سے شہ نشیں پہ امام زمن رہیں
حجرہ یہ اس لئے ہے کہ دولہا دلہن رہیں
کمرے کو لا کے جلد کبھی جا بچھاتی تھی
تحفوں کو کشتیوں میں کبھی وہ لگاتی تھی
سجدے میں بہر شکر کبھی سر جھکاتی تھی
گھبرا کے صحن سے کبھی ڈیوڑھی پہ جاتی تھی
چہرے پہ اک خوشی تھی پہ دل بیقرار تھا
فرزند فاطمہؑ کا اسے انتظار تھا
جا کر کبھی خواصوں سے کرتی تھی یہ کلام
کھانا پکاؤ جلد کہ آتے ہیں اب امام
بھر بھر کے آب سرد سے رکھدو ہوا میں جام
لبریز آب گرم سے کردو سبو تمام
پردیسیوں کو خیر سے جب گھر میں لاؤنگی
ہاتھوں سے اپنے ہاتھ سبھوں کے دھلاؤں گی

باریک سے باریک اور چھوٹے سے چھوٹے جزئیات کی یہ خوشنما نمائش وزیبائش، خطابت و مصوری، شاعری وحقیقت نمائی گہرے مسائل کو تمثیل کے ذریعے سمجھانا اور مثالوں سے حقائق کو واضح کرنا میر انیس کا بے مثال کمال ہے۔

انیسؔ ایک فارسی ادیب کی نظر میں

ایران کے فاضل و بالغ نظر ادیب اور کیمبرج یونیورسٹی کے فارسی کے پروفیسر آقائے امیر عباس حیدری نے حال میں ایک مفید مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ جسے "دانش" تہران نے شائع کیا ہے

فاضل مقالہ نگار انیس سے بھی بہت زیادہ متاثر ہیں۔ اور راکثر مراثی کا مطالعہ بھی فرما چکے ہیں۔ ان کے مقالے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام انیس کے علاوہ انیس پر لکھی ہوئی کتابیں مثلاً "شکسپیئر اینڈ انیس" جیسی کتابیں توجہ سے دیکھ چکے ہیں۔

اس مقالے میں انہوں نے کہا ہے کہ فارسی زبان میں محتشم کے علاوہ ان کے یہاں کوئی مرثیہ گو پیدا نہیں ہوتا۔ انیس کا مرثیہ سب سے پہلے انہوں نے محمود آباد کی ایک مجلس میں سن کر انیس کی طرف توجہ کی اور یہ رائے قائم کی:

انیسؔ نہ انساں مرثیہ سرا با ہست براستی در مرثیہ سرائی داد سخن دادہ حق مطلب راچناں کہ باید ادا کردہ است یا تعبیر اتے کہ خاص او ست مرثیہ را از آں صورت خشک اخوندی بیروں آوردہ است۔ بجرئت می توان گفت۔ در ایں فن استاد است کہ حریفی ندارد۔

انیس دوسرے مرثیہ نگاروں یا سادہ و خشک ذاکرین کی طرح نہیں۔ بلکہ وہ خود ایک سپاہی ہیں۔ جس کی رزمیہ و بزمیہ شاعری کے اعلیٰ امتزاج سے سننے والا اور پڑھنے والا بہادرانہ جذبات

اس کے بعد انیس کی پیدائش و نسب اور اُن کی گوشہ نشینی و خودداری کا ذکر کر کے زبان و فنونِ مرثیہ سے مہارت کا ذکر کیا ہے۔
پھر مراثی و رباعیات میں سے بعض بند اور کچھ رباعیوں کا نظم میں ترجمہ کیا اور ان پر اپنی رائے لکھی ہے:۔

ترجمہ میں موصوف نے بڑی محنت کی ہے۔ اور اکثر جگہ وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں لیکن کہیں کہیں ناکام بھی مثلاً اس شعر کا ترجمہ

خواہاں تھے زہر گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

تاکند تر لب پژمردہ گلاں
لالہ از شبنم تر لبریز است

مرثیہ کے ترجمہ میں اکثر یہی رنگ ہے

"نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری"

پورے بند کا ترجمہ ہے۔

خوانِ سخن راسخن من نمک
لال زباں شد چوں سخنور چشید

رنگ کلامم جو پدیدار گشت
رنگ نہ رخسارۂ حاسد پرید

مدح کن آلِ علی پنج پشت
چار شد و نوبت پنجم رسید

درحقیقت کسی بلند پایہ شاعر کے اشعار کا ترجمہ وہ بھی نظم میں بے مشق و تجربہ بہت دشوار ہے۔ اس لحاظ سے پروفیسر صاحب نے جو کوشش کی ہے وہ قابل توجہ اور لائق داد ہے۔ فاضل مترجم نے مرثیے کے ترجمے میں بہت محنت کی ہے اور رباعیات میں بہت کامیابی حاصل کی ہے۔ انیس کی کچھ رباعیاں۔ نظامی پریس لکھنؤ سے عنوان کے شائع ہو چکی ہیں۔ پروفیسر صاحب نے بعض سرخیاں اس سے اور بعض خود لکھ کر اس طرح ترجمہ کیا ہے۔ (ہم بخیال طوالت اردو رباعیات چھوڑتے ہیں)

رازِ حیات

انیس بڑے مفکروں کی طرح سوچتے ہیں۔ اور زندگی کا سراغ لگاتے ہیں۔ لیکن آخر میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زندگی خواب و خیال سے زیادہ کچھ نہیں۔

ما کودکی و شباب دیدیم و گذشت | ہستی چو آب دیدیم و گذشت
تا چشم ز بستیم معما نہ کشود | یک عمر تمام خواب دیدیم وگذست

رباعیات انیس نظامی پریس نمبر ۲۶

بگو مگو

صبح صبح چمن میں گزر ہوتا ہے۔ سرخ سرخ پھولوں کے تختے ایک طرف دوسری طرف بلبل کا ہنگامہ شاعر کو دیوانہ کر دیتا ہے۔

ہر لالہ ببیں چو جام مے در جوش است | نرگس بنگر مست و چہ خوش مدہوش است
ایں راز بگو چہ باشد در باغ | بلبل بہ غزل خوانی و گل خاموش است

رباعی نمبر ۴۲

جزر و مد

انیس کو سعدی کی طرح ہر پتی میں قدرت پروردگار نظر آتی ہے۔ اور وہ اس حاصل شدہ موتی کو عالم کے لئے عام کرتے ہیں

ہر برگ نشاں قدرت آں یکتا است | ہر گل اثرے ز شاہد بے ہمتا است
ایں سینۂ ما آدمیاں دریا نیست | ہر یک نفسے جزر و مد آں دریا ست

رباعی نمبر ۱۰

دور و نزدیک

ایک کھوئی ہوئی چیز آدمی آسمانوں میں ڈھونڈتا ہے اور اپنے ہی

میں پاتا ہے اور نحن اقربُ الیہ مِن حبل الورید، کا مطلب سمجھ کر کہتا ہے

چوں مردم دیدہ از نظر پنہانی — آں نور کہ دیدہ جوہرش خوانی
نزدیک تر ستی از رگِ جاں ہنوز — دور آں قدری کہ خود فقط میدانی

رباعی نمبر ۴

ایں جا و آں جا

شاعر شوریدہ سری کی حالت میں جنگلوں اور پہاڑوں میں سرگرداں آتا ہے اور ہر جگہ اس کا معشوق حاضر موجود ہوتا ہے۔ عین اسی حالت میں وہ گھبرا کر کہتا ہے

بر ہر چہ نظر کنم خدا می بینم — در جنگل و کوہ و در ہوا می بینم
ایں جا و آں جا ہر کجا می بینم — ماتم بدو چشم من چہا می بینم

رباعی نمبر ۳

بادِ مراد

شاعر ہند کے کسی عظیم الشان دریا کو دیکھتا ہے۔ پھر انسان کی حقیقت اور اس کی عظمت آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔

دنیا دریا ایں ہوس طوفان است — مانند حباب ہستی انسان است
دل لنگر دہر نفس بادِ مراد — کشتی تو سینۂ ناخدایاں است

رباعی نمبر ۹۴

نقارچی (طبال ڈھل زناں)

آں را کہ خدا مقام و جاہے بخشد — بر او دست کہ خاکی و فروتن باشد
آں مغز نہی است کہ شاید خود را — چوں طبل کہ در دستِ ڈھل زن باشد

رباعی نمبر ۱۰۵

گویا اسے تہی مغز، متکبر اشخاص سے ہمدردی نہیں۔ وہ ان سے انکساری کا مطالبہ کرتا ہے اگر وہ جھک کر نہیں مل سکتے تو ان کے ہاتھ میں نقارہ دے کر ان کی بے مائیگی کا اعلان کرنا چاہتا ہے۔

گرد باد

خوش خو اور با اخلاق کی مدح کرنے کے بعد تند مزاج اور بدخو کی مذمت کی ہے۔

گر خوئے تو نیک است ترا باکے نیست
مجمر غم بنود نصیب آتش خو را

سرکش اگری بہرہ زاد را کی نیست
در دامن گرد باد جز خاکے نیست

رباعی نمبر ۱۱۱

ہمہ اوست

انیسؔ کی رباعی ہے۔

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زبان پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

باد سحرا آشفتہ ترا می جوید
بلبل بہ چمن وصف ترا می گوید
ہر رنگ کہ ہست جلوۂ قدرت تست
ہر کس کہ گلے چید ترا می بوید

رباعی نمبر ۱

دُرِ یکتا

حیدر بگدایاں دُرِ یکتا می داد
ہر قطرہ طلب یکسرہ دریائی می داد
آں شاہ کرم ور آں جاں دادن
ہر قاتل خود شہد گوارا می داد

رباعی نمبر ۱۶۱

بادہ بے دُرد

ہر یک قدمے لغزشِ مستانہ ماست — فردوس بریں گوشۂ میخانۂ ماست
از بادۂ دردِ علیؑ سرمستیم — جام است دو چشم و قلب پیمانۂ ماست

رباعی نمبر ۱۵

موج و دریا

ساقی اگر آں یکے است صہبات یکے — اندیشہ کجا موج و دریا ست یکے
ہاں نورِ محمدؐ و علیؑ یک نور است — اسم است دو تا و لے مسمات یکے

نشانِ سجدہ

یارب چہ مقامی است مقامِ آں شاہ — عزو شرفے ورائے ہر عزت و جاہ
ایں داغ بہ پیشانیٔ سجادہ نشین — بر داغِ دلِ شاہِ شہید است گواہ

کم سخن

عباسؑ چناں صفِ شکنی کہ دیدہ است — چوں اکبرؑ شہ گل بدنے کہ دیدہ است
خارے بہ گلوی غنچہ لب آمد و لب بست — چوں اصغرؑ او کم سخنے کہ دیدہ است

مرثیے نئے دور میں

نجم آفندی کا مرثیہ معراجِ فکر

میں نے لکھنؤ میں مرثیہ کا وہ عہد تو نہیں دیکھا جب میر انیس کے جانشین، نفیس، عروج و رشید رونق آرائے منبر تھے۔ خوش قسمتی سے اس روایت کا آخری دور ضرور دیکھا ہے۔ رجب کا مہینہ آیا ایک خاص قسم کی گہما گہمی شروع ہو گئی۔ قصیدوں کی تیاریاں اور مرثیوں کے چرچے ہونے لگے ۔ کہیں قصیدوں کی محفل ہے اور تین تین راتیں اسی میں گذر گئیں۔ بڑے بڑے عالمانہ اور شاعرانہ اجتماع میں صفی، عزیز، محشر، شفیق، آفتاب، فاضل جیسے بزرگ قصیدے پڑھتے اور داد سخن لیتے کبھی جوان اور نوعمر شاعر بڑوں سے بازی لے جاتے۔ اجتماعات کے شہرے تھے ۔ اور یہ محفلیں قصیدہ گوئی کا دبستاں

۲۵ رجب کو عہدِ انیس و دبیر کی قائم شدہ مجلسوں کی یاد میں مجلس ہوتی تھی

انیس کے آخری پوتے جناب فائز تو تصنیف مرثیہ دل آرام کی بارہ دری میں پڑھتے تھے یہ عمارت چوپٹیوں میں واقع تھی وہاں سے ڈیڑھ میل دور پاٹا نالے والی گلی میں واقع میر باقر سوداگر کا امام باڑہ تھا۔ یہاں مرزا دبیر کے پوتے رفیع صاحب تو تصنیف مرثیہ سناتے تھے۔ ان دو اہم تاریخی مجلسوں کے علاوہ نواب علی صاحب کے مکان پر مؤدب صاحب، ناظم صاحب کے امام باڑے میں قدیم صاحب، ذکی صاحب فائق صاحب، خبیر صاحب، نسیم صاحب، اثر صاحب اور شدید صاحب کے مرثیے سننے میں آتے تھے۔

محمد حسن، جنہیں اہل لکھنؤ لڈن صاحب فائز کہتے تھے جناب دولہا صاحب عروج خلف میر خورشید علی نفیس خلف میر ببر علی انیس کی عزتوں کے وارث تھے۔ لڈن صاحب فائز ذرا دبتے ہوئے قد۔ قدرے بھاری بدن کے بزرگوار، بیمار اور مرض ضیق النفس کا شکار تھے۔ پچاس پچپن برس کی عمر، سفید براق انگرکھا اور دوپلی ٹوپی پہنتے تھے۔ عام طور پر شیروانی اور رام پوری ٹوپی میں بھی ملبوس دیکھا ہے۔

صبح آٹھ نو بجے سے بارہ دری کی خوبصورت عمارت، کشادہ صحن، طویل و عریض دالان، دالان کے بعد شہ نشین، دالان میں منبر تھا۔ سفید براق چاندنی کا فرش، فرش پر نازہ ملار لیے حقے لگے ہیں۔ اگالدان دھرے ہیں۔ ایک صاحب کمر پر کوری ٹھلیا لیے، مٹھی بھر بھر پان نکالے ہیں اور نفیس گلوریاں حاضرین کی خدمت میں پیش کرتے جاتے ہیں۔ بانیٔ مجلس دور دور سے آنے والوں کی پذیرائی کرتے ہیں۔ "آداب عرض"، "خدا سلامت رکھے"، "خدا سلامت رکھے"، "آئیے تشریف رکھیے"، کہہ رہے ہیں۔ دالان اور شہ نشین بھر گئی، مجمع پورا ہو گیا آہستہ آہستہ باتیں ہو رہی ہیں۔ کوئی دولہا صاحب کے پڑھنے کی خوبیاں بیان کر رہا ہے۔ کوئی کسی معرکہ کی مجلس کا آنکھوں دیکھا حال کہہ رہا ہے، کوئی عارف و عروج کی شاعری کے تذکرے میں مصروف ہے۔ کوئی رشید صاحب کے ساقی نامے، جوانی، بڑھاپے پر رباعیاں اور بند سنا رہا ہے گذشتہ دور کی بہترین

ادبی محفلوں کی یاد سے ذوق کو سرشار اور بنا مرثیہ سننے کے لئے ایک دوسرے کو تیار کیا جا رہا ہے کہ دس گیارہ بجے کے درمیان ”لڈن صاحب“ مجلس میں داخل ہوئے اِن کے ساتھ تین چار دوست، ایک صاحب کے ہاتھ میں لبستہ ہے صدرِ مجلس میں قالین پر آن کر تشریف فرما ہوئے پشت پر منبر ہے۔ احباب سے صاحب سلامت اور مزاج پرسی ہو رہی تھی کہ پھیلے ہوئے پیچاسوں حقّے اٹھائے جانے لگے۔ اور لوگ پہلو بدل بدل کر بیٹھ گئے اتنے میں بانی مجلس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی ”بسم اللہ“ فائز صاحب اٹھے اور منبر پہ ہاتھ رکھ کر کچھ زیرِ لب کہا اور زیبِ منبر ہوئے ایوان درود و صلوٰۃ کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ ایک صاحب نے لبستہ پیش کیا۔ یہ مستطیل لبستہ، ایک بڑے سے رومال کے اندر لپیٹے ہوئے مرثیے سے عبارت ہے فائز صاحب نے ذرا آستین چڑھائی، رومال کھولا اس میں سے چوتہا چمڑے کا کور نکلا، ایک تہہ کھولی رومال زانو پر پڑا ہوا ہے ایک سرا گھٹنے کے نیچے ہے دوسرا اوپر، فلسکیپ سائز کے خوبصورت کاغذ پر چار بندی صفحہ خوشخط مرثیہ، چمڑے کی تہہ سے برآمد ہوا یہ مرثیہ اِسی سال کہا گیا ہے، مرثیہ پر۔ ایک دو ورق الگ سے رکھے ہیں جن پر ایک دو رباعیاں اور ایک دو سلام ہیں۔

فائز صاحب نے نظر بھر کے مجمع کو دیکھا۔ اگر کوئی بات کہتے کی ہے تو بڑے آہستہ سے کچھ کہا ”علالت کی وجہ سے مرثیہ کا حق تو ادا نہ کرسکا، بہرحال جو کچھ عرض کیا ہے پیش کرتا ہوں“ پھر مرثیہ کا کوئی خاص حصہ مثلاً چہرہ، گھوڑا، تلوار، ساقی نامہ یا جنگ جس میں محنت کی اس کا تعارف کر۔ مگر مختصر اور کبھی کچھ کہنے بغیر ایک دو رباعیاں پھر سلام پڑھ کر مرثیہ شروع مطلع پڑھا اور مجلس ابھری، مصرعوں اور بیتوں بندوں اور قافیوں پر داد ملنے لگی کوئی بیت یا بند دو مرتبہ بھی پڑھوایا گیا۔ کبھی کوئی خاص نکتہ آگیا تو ذرا رک کے ”آپ حضرات ماشاء اللہ اہل نظر ہیں جدِ مرحوم نے یہ بات یوں کہی ہے۔ میں نے جسارت کی ہے اور یوں عرض کیا ہے“ اب اہل نظر دیکھ رہے ہیں کہ انہوں نے

کیا کہا تھا۔ یا دبیر کی بات ہے تو ان کا حوالہ یاد آرہا ہے رشید و نفیس کی بات ہے تو وہ کہی جا رہی ہے مگر صرف جاننے والے آہستہ سے کہہ رہے ہیں بند سنا اور چھتیں اڑ گئیں، داد کی صدائیں ہیں فائز صاحب مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ کوئی شعر حل پر داد دے رہا ہے کوئی پڑھنے کو سراہتا ہے مصائب میں گریہ ہوا پٹس پڑی اور مجلس ختم ہو گئی۔

مجمع اٹھا، ایک دوسرے سے گذشتہ سال اور اس سال کے مرثیے پر تبادلہ خیال ہو رہا ہے، کسی کے نزدیک اب کی سراپا اچھا تھا، کوئی ساقی نامہ پر وجد کر رہا ہے کسی نے کہا مصائب اچھے تھے۔ صاحب مرثیہ خوانی انیس کے خاندان پر ختم ہے جناب یہ زبان اور روانی لاکھ کوشش کریں مرزا صاحب کے خاندان میں کہاں آسکتی ہے۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ بس تبرک ہیں دولہا صاحب کی خواندگی کی جھلک کہا جاتے ہیں۔ ہاں نہ لگ گئے آواز ساتھ نہیں دے سکی جب تو خیر مگر آمد خوب پڑھی۔ رجز جس تیور سے ادا کی ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی ہم اس گروہ میں تھے جس کے خیال میں طاہر صاحب اور فائز صاحب کا مقابلہ درست نہ تھا۔ یہی باتیں کرتے ہو بیٹوں سے یار رجے والی گلی جا رہے ہیں دو بج چکے ہیں، سوداگر کے خوبصورت امام باڑے کے بڑے مگر بوسیدہ پھاٹک سے اندر داخل ہوئے، صحن میں بانیان مجلس نے استقبال کیا، حوض سے آگے بڑھے تو چبوترہ بھرا ہوا، دالان لبریز، دالان میں قد آدم قلعی آئینے دیوار گیریاں چھت میں بڑے بڑے جھاڑ، ہانڈیاں خوبصورت و قدیم شیشہ آلات لگا ہوا ہے منبر پر مرزا محمد طاہر رفیع صاحب جلوہ افروز ہیں، سفید ململ کی اچکن، سر پر رام پوری ٹوپی ساٹھ سے اوپر کا سن، آواز آہستہ ہو کر کچھ اور بلند ہو تو کچھ اور سلام پڑھ رہے ہیں یا چہرہ، مجلس جمی ہوئی ہے داد مل رہی ہے معرکے اٹھ رہے ہیں۔ دور دور شہر مل اور قصبوں سے لوگ وضعداری کے طور پر آگئے بیٹھے ہیں رفیع صاحب بار بار جد مرحوم اور والد بزرگوار کے حوالے دے رہے ہیں۔

آغاز مرثیہ میں میں نے سنا کہ وہ کسی خاص بزرگ سے مخاطب ہوئے بھائی صاحب آپ کے سامنے مرثیہ پڑھنا جسارت ہے، یہ سا تواں مرثیہ ہے اسی

اسی بحر میں چار مرثیوں میں معراج کا حال نظم کر چکا ہوں، اب کی پھر محنت کی ہے۔ یہ بھی دیکھئے گا" میر صاحب قبلہ مرحوم و مغفور نے فرمایا ہے "شاید کوئی بات پیدا ہو گئی ہو" جد بزرگوار نے یوں فرمایا ہے آپکے سامنے ہے انہیں کا فیضان ہے" مختلف جملے کہتے جاتے ہیں، بند بر بند، اور مضمون پر مضمون سنا رہے ہیں۔ مجمع ہے کہ کھڑے ہو کر داد دے رہا ہے "واہ وا" کا شور ہے مصرع ختم نہیں ہوتا کہ تعریف شروع ہو جاتی ہے، چوتھا مصرع سنا اور لوگ چپ" اب بہت مشکل تھی، ملاحظہ ہو بیت سنتے ہی پھر شورِ تحسین شروع ہو گیا۔

چہرہ، گریز، سراپا، آمد، سواری، رجز، تلوار، گھوڑا، جنگ، شہادت، اور بین پر مرثیہ ختم ہوا۔ دو گھنٹے کی نشست کے بعد لوگ ہشاش بشاش اٹھے مرثیہ پر بحث و نظر کا سلسلہ شروع ہوا۔ مرثیہ گوئی تو مرزا صاحب پر ختم ہے انیس کی زبان، دبیر کی شان، قابلیت و استادی کا تذکرہ ہے۔

رفیع صاحب اور فائز صاحب پر دبستان کا باب ختم ہو گیا۔ یوں قدیم صاحب نے مجلس انیس اور صادق صاحب نے مجلس دبیر کو برقرار رکھا۔ قدیم صاحب انیس کے فرزند اور انیس کے پوتے تھے اور صادق صاحب مرزا محمد طاہر رفیع کی یادگار مگر انکے اصلی جانشین ذاکر صاحب تھے۔ جو باپ کے سامنے جوانی میں مر گئے۔ ایک اور گروہ تھا جو بابو صاحب فائق یعنی سید ظفر حسن صاحب کو خاندان انیس کا رخیل مانتا تھا۔ فائق صاحب دبلے پتلے آدمی، اکہرا بدن رکھتے تھے۔ مگر آواز، تیور، انداز اور پڑھنا بڑا دلکش تھا۔ ان کی مجلس میں سرو قد اٹھ کر جتنی داد فائق صاحب کو ملتی تھی دوسری مجلسوں میں کم دیکھی ہے عام طور سے لوگ کہا کرتے تھے کہ بابو صاحب دولہا صاحب کی تصویر دکھا دیتے ہیں۔ فائق صاحب پر پڑھنا ختم ہو گیا۔

ان بزرگوں کے ساتھ ساتھ خاندان عشق و ادب کے چشم و چراغ جناب مغلوب صاحب اپنی بزرگی، زبان کی خاص رعائیوں، بیان کے ضابطوں اور مرثیہ کے آداب میں بہت عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، اشرف آباد میں

۲ رجب کو ان کا نو تصنیف مرثیہ بڑے اہتمام سے سنا جاتا تھا۔ اور وہ مجلس بڑی
شان کی مجلس ہوتی تھی۔

یہ سب چراغ گل ہو گئے اب مہذب صاحب اور رشید صاحب باقی ہیں
خدا سلامت رکھے انیس و دبیر کے آخری دور میں برصغیر ادب کی نئی تحریکوں سے
آشنا ہو چکا تھا، زندگی اور شاعری کے رشتے دریافت کئے گئے تھے تجدد اور ترقی
موضوعات و مسائل بحث میں آنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے آخری عشرے میں موضوعاتی
شاعری کی لہر دوڑ گئی، نئے نعرے، نئے فلسفے، اصلاح معاشرہ، تطہیر افکار جیسی
اصطلاحیں عام ہوئیں، جنگ عظیم اور نئے انگریزی ادب کی بدولت سیاست نے
روزمرہ میں اپنی جگہ لے لی ہر بات کا لہجہ بدل گیا، مقدمہ شعر و شاعری، آب حیات
اور موازنہ انیس و دبیر نے مرثیہ گویوں پر غیر معمولی اثر ڈالا۔ مرزا محمد جعفر اوج
مرحوم نے نئے مسائل کی طرف توجہ کی، محمد ہادی رسوا نظم طباطبائی اور ان کے
ساتھیوں نے پہلو بدلے اور مرثیہ میں کچھ کمی محسوس کی جانے لگی اتنے میں کچھ قومی
تقاضے شدید ہوئے۔ ایک آدھ تصادم ہوا۔ ادبی فضا میں جدید و قدیم پر بحث و مناظرہ
کی سی کیفیت طاری ہوئی اس وقت کے جوانوں اور نوجوانوں نے جو طبع آزمائی
کی وہ کچھ نہ کچھ نئے لہجے اور نئے تیور میں تھی یہ تجربہ پہلے کس نے کیا۔ اور اس کی
ہیئت ابتدائی کیا تھی؟ اس کے لئے اوج، مرزا محمد ہادی رسوا، حکیم آشفتہ، شاد
عظیم آبادی، پروفیسر جمیل مظہری، جوش ملیح آبادی، آل رضا، اور اس دور کے دوسرے
گم نام شعرا کی کوششوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

واضح طور پر آل رضا اور شبیر حسن جوش اور نجم آفندی نے غیر معمولی شہرت حاصل کی
آل رضا صاحب کا مرثیہ "کربلا کے بعد" فکری اور منطقی اسلوب کا مسدس
دانشوروں میں پڑھا گیا اور اس نے ایک حلقہ کو بے حد متاثر کیا۔ جوش ملیح
آبادی کا مسدس "حسین اور انقلاب" وقت کا نعرہ تھا، جوانوں، طالب علموں
اور ترقی پسند افراد نے جوش کا مسدس گوشے گوشے میں پھیلا دیا۔ نجم آفندی

اپنے جدید نوحوں کی وجہ سے شہرت عام کے عروج پر پہنچ چکے تھے۔ ان کے والد بزم صاحب بہت اعلیٰ درجے کے مرثیہ گو تھے۔ نجم صاحب کے لئے نوحہ کے بعد مرثیہ آسان بھی تھا کہ ذہنی اور فکری تجربے رکھتے تھے مشکل بھی تھا کہ دونوں کی ہیئت مختلف ہوتی ہے۔ نجم صاحب نے فیض آباد، حیدر آباد اور مختلف بڑے شہروں میں مرثیہ پڑھا اور پوری طرح کامیابی حاصل کی "فتح مبین" ۱۹۴۵ء کے لگ بھگ لکھنے کے بعد ایک مرثیہ ۱۹۵۹ء میں لکھا "معراج فکر" بہت مقبول مرثیہ ہے۔ اس کا عنوان خود غماز ہے کہ شاعر کس فلسفی نظر اور فکری انداز سے بات کرنا چاہتا ہے۔ قوم کے علمی و عملی زوال کے پس منظر میں واقعات و مسائل کا ربط اور مسائل سے نتائج کا تعلق اور نتائج کی روشنی میں عقیدہ و عمل کی استواری کلیہ پیام نجم صاحب کا مقصد ہے۔ نجم صاحب جوشِ عقیدت کو جوشِ عمل کا سبب مانتے ہیں اور اسی کو بروئے کار لانے کے خواہش مند ہیں۔

یالیتنی کا ذوق، اور احساسِ کمتری
محروم ارتقا سے ہیں تنظیم سے بری

عزم و عمل ہے وہ نہ وہ ایثار پروری
مانی ہے کیا زبان ہی سے ان کی سروری؟

دیتے ہیں مشکلیں ہیں فقط ان کے واسطے
قربانیاں ہوئی تھیں اسی دن کے واسطے؟

جس نے امور خیر کو بخشی حیاتِ نو
جس کی نولئے درد میں ہے زندگی کی رو

صدیوں سے جسکے نقشِ قدم دے رہے ہیں ضو
جو سو گیا بڑھا کے چراغِ وفا کی لو!

بدلی عمل کی شکل ارادے بدل دیئے
جس نے مطالبات کے جادے بدل دیئے

جذبے کی اس فراوانی میں شعور کی زندگی چھپی ہوئی ہے اور شعور کی یہ برقی رو جو پورے مرثیہ میں پھیلی ہوئی ہے، اسی پھیلاؤ نے مرثیہ میں نئی فضا پیدا کی ہے بعض شاعر جو مرثیے کی فنی باریکیوں سے غفلت برتتے ہیں یا وہ تجربہ کار شاعر جو مرثیہ کا مزاج پہچانتے ہوئے۔ مرثیہ کی روح میں تبدیلی، اسے سائنس یا سیاست فلسفہ یا انقلاب کا نعرہ بنانے کی سعی کرتے ہیں وہ مرثیہ اور قومی نظم کے امتیازات میں حدِ فاصل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مرثیہ کا خاص رکھ رکھاؤ، واقعاتِ کربلا سے مضبوط وابستگی چاہتا ہے

مسائل وافکار کا مجلسی رشتہ اگر منقطع ہو جائے تو لطف نہیں رہتا۔ مرثیہ وہی ہے جسے مجلس میں پڑھا جائے تو سننے والے یہ سمجھیں کہ مجلس ہو رہی ہے، اس عقیدے کی تازگی اور اشک باری کا سلسلہ باقی رہے لوگ سمجھیں کہ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے فضائل و مصائب سن رہے ہیں لکچر یا وعظ نہیں ہے

سوئے بھی کم تھے، اتنی جماعت تھی مختصر
لشکر کے اعتبار سے تنظیم کی مگر !
آگے علم بدوش تھے عباسِ نامور
ممکن ہے ہو یہ مقصد سلطانِ بحر و بر
قلت میں بھی ہو سطوت و اجلال چاہیے
تنظیم کا خیال بہر حال چاہیے

انصار میں حبیب کا بھی ہے عجیب مقام
کوفے سے کیسا وقت پہ آیا ہے تیز گام
ہوتا ہے یوں خلوص عقیدت کا احترام
بنت نبیؐ کے خیمے سے آیا اسے سلام
بہ فخر اپنے ساتھ وہ جان باز لے گیا
اس تحفۂ سلام کا اعزاز لے گیا

اور یہ بند درد انگیز اور گریہ خیز دیکھیے:

انصار کو جہاد کی پہلے ملی رضا
خاموش تھے ادب سے عزیز اور اقربا
یہ مسئلہ ہے گرچہ بظاہر عجیب سا
شاید امام وقت کے پیش نظر یہ تھا
مرنا ہی سب کو ہے تو یہ پہلے نہ جائیں کیوں
کچھ دیر اور پیاس کی ایذا اٹھائیں کیوں

مرثیہ میں ایک بند کے بعد دوسرا بند اور چار مصرعوں کے بعد بیت بڑی نازک تکنیک ہوتی ہے۔ یہاں گریز بھی ممکن ہے اور الجھاؤ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ بات پھیل بھی سکتی ہے اور اس قدر مختصر بھی کہ سننے والے یا واقعہ کو بھول جائیں یا سلسلہ درہم برہم ہو جائے اسی موڑ سے شاعر کی فنی قوت کا اندازہ لگایا جاتا ہے نجم صاحب کا مرثیہ عموماً مختصر ہوتا ہے "معراجِ فکر" بھی طویل مرثیہ نہیں ہے تیرہ بند ہیں پچاس بند جذبہ کے بیان اور دعوتِ فکر و عمل، موضوعِ مجلس کی طرف توجہ مبذول کرنے کے لئے ہیں، اور آخر میں بین یا مصائب گریہ کی خواہش اور مجلس کو رلانے کا اہتمام ہے

اللہ رے نبیؐ کے نواسے کی موت تھی
زینب کا غم شریک ہوا اتنا نہ تھا کوئی
برسا فلک سے خون زمیں تھرتھرا گئی
جو موج اٹھی فرات سے سر پیٹتی اٹھی
ماتم کا اہتمام کیا شش جہات نے
پرسہ دیا امام کو کل کائنات نے
کس درجہ دردناک تھا وہ وقت وہ مقام
خاموش فرطِ غم سے تھے اہلِ حرم تمام

غیرت سے بے کسوں کو نہ تھی طاقت کلام
بے رحم کر رہے تھے اسیری کا اہتمام
آواز تھی بلند سکینہ کے بین کی
مقتل میں ہو رہی تھی یہ مجلس حسینؑ کی

ہر دور میں رہے گی مجالس کی زیب و زین
بدلے یہ کائنات، رہیں گے نہ دل کے بین
ہوگا نئے اصول سے پھر ماتم حسینؑ
سمجھیں گے اہل درد زیارت کو فرض عین

فرق آئے گا نہ ولولۂ اشتیاق میں
لاکھ انقلاب آئیں مزاجِ عراق میں
اہل زمیں کی آج ستاروں پہ ہے نظر
ممکن ہے کامیاب رہے چاند کا سفر

ہیں اپنی اپنی فکر میں ہر قوم کے بشر
مردانِ حق پرست کا جانا ہوا اگر
عباسِ نامور کا علم لے کے جائیں گے
ہم چاند میں حسینؑ کا غم لے کے جائیں گے

مرثیہ ختم کرتے کرتے سامعین کو پھر آغاز یاد دلاتے ہیں۔

صورت گر جلالتِ اسلام ہے حسینؑ
اک مرکز روابط اقوام ہے حسینؑ
فکر و نظر، مشیت و الہام ہے حسینؑ
محبوب اہل درد میں اک نام ہے حسینؑ
دریا مخالفت کے چڑھے اور اتر گئے
باقی رہا یہ نام حوادث گذر گئے

نجم صاحب وقت کی پکار سنتے اور سب کے دل کی بات کہتے ہیں۔

صدیوں سے جسکی مدح سرائی کا دور ہے
ہر دور میں یہ مسئلہ فکر و غور ہے!
اس بات میں سکوت طبیعت پہ جور ہے
محروم در ہو کوئی یہ بات اور ہے
جو اہل دل ہے دست نگر کربلا کا ہے
ہر ملک کے ادب پہ اثر کربلا کا ہے

بے امتیاز مذہب و ملت ہے جس کا سوگ
اکثر مٹا دیا ہے تعصب کا جس نے روگ
کتنے ہیں اب قریب، بہت دور تھے جو لوگ
نامسلموں نے عشق میں جسکے لیا ہے جوگ
بھارت نواسیوں کو خطاب اک نیا دیا
کتنے برہمنوں کو حسینی بنا دیا

عقیدے سے زندگی، عقیدے سے استدلال، عقیدے سے عمل اور عمل سے والہانہ دل بستگی نجم کا نصب العین ہے، بقول پروفیسر احتشام حسین "انکا عقیدہ علم و عرفان کا فرزند ہے انکا یقین ادراک و شعور کا پیدا کردہ ہے۔ اس لئے انکی شاعری میں ان کی روح کی آواز سنائی دیتی ہے جسے انکی جدت طراز طبیعت ایک ایسے زاویے سے پیش کر دیتی ہے جس پر دوسروں کی نگاہ نہیں جاتی۔"

مرثیہ کا ارتقا

(آل رضا کے مرثیہ پر تنقید)

دنیا کی زبانوں میں "اردو" اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر یہ اہمیت بھی رکھتی ہے کہ اسکی عمر بہت چھوٹی لیکن اس کا سرمایہ بہت بڑا ہے پھر اس کا ابتدائی مواد اسلام کی بنیادوں پر مہیا کیا گیا ہے۔ اور مذہب میں بھی حیثیت سے[1] اس کا موضوع رہا ہے مثلاً اردو کا باقاعدہ شاعر جو قدیم تر بھی ہے محمد قلی قطب شاہ (متوفی ۱۰۲۰ھ مطابق ۱۶۱۱ء) نے دوسرے اصنافِ سخن کے ساتھ "مرثیہ" بھی لکھا ہے۔ اسی طرح نثر کی پہلی باقاعدہ ادبی کتاب "کربل کتھا" بھی مسوداتِ مجالس پر مشتمل ہے جسمیں نثر کے ساتھ نظم کے ٹکڑے بکثرت موجود ہیں کربل کتھا کا سنِ تالیف ۱۱۴۵ھ مطابق $\frac{32}{33}$–۱۷ء ہے۔

سنہ ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء سے سنہ ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۳ء تک تقریباً ایک سو بیس سال کا فرق ہے۔ یہ زمانہ اردو نظم کی تاریخ میں مرثیہ کا عہد ہے۔ عبداللہ قطب شاہ متوفی محرم سنہ ۱۰۸۳ھ ملا وجہی متوفی ۱۰۸۰ھ مرزا بیجاپوری متوفی ۱۰۸۳ھ، خواجہ ہاشم بیجاپوری (حیات ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء) عبدالجلیل (متوفی ۱۱۰۰ھ ہجری) سید محمد فیاض ولی ویلوری مدراسی (۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء) جیسے سیکڑوں شاعر ہیں ملاحظہ ہو "دکن میں اردو" "یورپ میں دکھنی مخطوطات" "فہرست کتب خانہ سالار جنگ"، نیز دوسری دکنی تالیفات نیز میری کتاب "تاریخ عزاداری" (طبع رہنما کار محرم نمبر ۱۹۶۲ء) "سلطانِ دکن قطب شاہ کے مرثیے" المبلغ سرگودھا مئی ۱۹۶۷ء وغیرہ

---

[1] بعض حضرات نے بیجا تعصب سے کام لے کر امیر خسرو، بھیرداس تلسی داس سعدی کاکوروی وغیرہ کو اردو شاعری میں حق تقدم دینے کی کوشش کی ہے پھر آگے بڑھکر یہاں تک کہہ دیا ہے کہ دکھنی دعوی کے زمانے سے پہلے اصلی اور صحیح اردو کے مقابلے میں ایسی تھی جیسے ڈارون کا بندر انسان کے مقابلے میں، اگر ہم تسلیم کر لیں کہ حضرت شاہ قطب عالم گجراتی حضرت بابا شیخ فرید گنج شکر کی زبان سے اگر دس پانچ الفاظ یا دو چار فقرے ایسے نکل گئے ہیں جن کو اردو کا رنگ بنیاد کہا جا سکتا ہے تو ہم جسطرح انکے فیضِ باطن کو اپنے لئے نعمت جانتے ہیں انکے الفاظ کو بھی اپنی زبان کیلئے مشعل راہ سمجھتے ہیں "اب دیکھیے وہ ڈارون کا بندر کیسے انسان بن گیا ہے"

(مختصر تاریخ مرثیہ گوئی)

دکنی دور کے مرثیوں پر نظر: دکن کے کم از کم دو سو سال مرثیے کے لئے بڑے مفید نتائج سے بھرپور ہیں۔ جن شاعروں کے مراثی دیکھے گئے ہیں وہ زبان و بیان میں یکساں نہیں ہیں۔ کچھ بہت اجنبی ہیں مثلاً قطب شاہ غواصی، وجہی، نوری کو لے لیجئے۔ صاف زبان والوں میں ولی کاظم، عبدالجلیل وغیرہ ہیں مجموعی طور پر اس ذخیرے کا عالم یہ ہے کہ جو چیزیں شمال کے مرثیہ گویوں میں انتہائی بلندیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ انکی داغ بیل دکن میں پڑ چکی تھی۔ ہم اپنے اس بیان کو مختلف مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

ادبیت: کسی صنف شاعری میں کسی قسم کا کمال پیدا کرنے سے پہلے شاعر جس چیز کی طرف سب سے پہلے توجہ کرتا ہے وہ ادبیت ہے اور ادبیت کا معیار زبان و مکان کے اعتبار سے جداگانہ ہوا کرتا ہے۔ تہذیبی علامات کا دکنی لہجہ ہونے کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ان مرثیوں میں ایک فنی شعور موجود ہے۔ جو شروع شروع میں دبا دبا سا تھا۔ بعد میں ابھرا، عزلت اور کاظم اور ولی نیز رضی وغیرہ کے مراثی میں تو بڑی شعریت ہے یعنی بیان و اظہار، طرز و اسلوب میں حسن ہے۔

کاظم، قطب ثانی دور کا مرثیہ گو[1] ہے اور کہتا ہے:-

تم اپنے دلبراں کی خبر لو علی ولیؑ	بے تاج سروراں کی خبر لو علی ولیؑ
بیٹوں او پسراں کی خبر لو علی ولیؑ	ظلم و ستم گراں کی خبر لو علی ولی
آرام دل سکینہ بے تاب کو نہیں	انکھیاں میں اسکے راہ دیکھو خواب کوں نہیں
کہیں انتہا جو درد کے اسباب کو نہیں	غم ہائے بے کراں کی خبر لو علی ولیؑ
جن کو رسول اپنے گود میں رکھتے تھے دوش پر	دریائے خون سر سیں چلا ان کے دوش پر
کیا صبر کرتے ہیں دو لب کو خموش کر	اس ناز پروراں کی خبر لو علی ولیؑ!
ہے سر پہ ان کے تیغ کہستان کے سوش	دل خوں ہوا ہے غم سوں بدخشان کے لسوش
برسے انجھو نین سیں نیساں کے سوش	اوس پاک جوہراں کی خبر لو علی ولیؑ

---

[1] پروفیسر اعجاز حسین الہ آباد یونیورسٹی کے خیالات سے استفادہ ہے۔

گلزارِ احمدی پہ چلی صرصرِ خزاں — کانٹوں پہ سوگوار ہو بیٹھے ہیں بلبلاں
ہر سرو راستی پہ کریں نوحہ قمریاں — بیدل صنوبراں کی خبر لو علیؑ ولیؑ

اظہار و ابلاغ۔ اندازِ بیان کی دل کشی اور استعارے کی ندرت

ہے سر پہ ان کے تیغ کہستان کے روش — دل خوں ہوا ہے غم سوں بدخشاں کے روش

کو ذرا بدل کر اپنے لہجے میں دیکھئے:

ہے سر پہ ان کے تیغ کہستان کی طرح — دل خون ہوا ہے غم سے بدخشاں کی طرح
گرتے ہیں آنسو آنکھ سے نیساں کی طرح — ان پاک جوہراں کی خبر لو علیؑ ولی

سر، تیغ، کوہستان، بدخشاں اور دل خونیں کا مقابلہ کر کے لعل بے بہا سے استعارہ شاعر کی قدرتِ اظہار کا واضح ثبوت ہے۔ باوجود اختلاف محاورہ مدت کے بعد بھی ہم تازگی اور خوبصورتی محسوس کرتے ہیں خصوصاً جب وہ کہتا ہے ؎

گلزارِ احمدی پہ چلی صرصرِ خزاں — کانٹوں پہ سوگوار ہو بیٹھے ہیں بلبلاں
ہر سرو راستی پہ کریں نوحہ قمریاں — بیدل صنوبراں کی خبر لو علیؑ ولیؑ!

دونوں شعروں کی ترکیب، مناسبات کی رعایت، تشبیہہ و استعارہ کی نزاکت، بات کہنے کی سلیقہ مندی ملاحظہ کریں۔ شعر کی تمام خوبیاں موجود ہیں شاعر کی مکمل تاثراتی کیفیت سامنے آجاتی ہے۔ فکر آفرینی، حسنِ صورت و آہنگ ذوق آفریں ابلاغ کی اچھی مثال ہے۔ اسی سلسلے کے شاعر ہیں، روحی، شاہی لطیف اور سید آل۔ جو کہتے ہیں

آج غمناک ہیں چمن کے گل — بلکہ دل چاک ہیں چمن کے گل
غم زدہ سینہ داغ حیراں ہیں — نرگس و لالہ، یاسمین کے گل

(روحی)

شاہی، محمد قلی قطب کے عہد کا مرثیہ گو ہے۔ شاہی کا لہجہ اور اس کا فنی شعور مرثیہ کے لیے بے حد موزوں ہے، وہ کہتا ہے۔

کریں محفل سجتے ایسی کہہ نا سکیں دل کی بات — چمکی بجلی گرجے بادل مینہ کے سات اندھاری ہے

ٹھنڈے نپے اور تن برہنا سندھوں سند سب اکڑے ہیں
ننگے پاؤں باقر بیڑی کا طوق گلے میں جکڑے ہیں
بے گنہ نبی کے فرزند بن تقصیروں فریادی پکڑے ہیں
بھوکے پیاسے کئی کئی دن کے مدت سے بیمار امی ہے

(یورپ میں دکھنی مخطوطات ص ۱۸۳)

غلام علی کا ایک مرثیہ پچیس شعروں پر مشتمل ہے۔ ان شعروں میں ادبیت اور فنی نمود ملاحظہ کریں۔

اے اہل درد اشک سوں انکھیاں کو تر کرو
نکلیا ہے پھر یو ماہ محرم نظر کرو
پھر تن کے عود سوز میں غم کی انگار آج
جیواں کو عود ہور دلاں کو اگر کرو

سید ان نامی مرثیہ گو کہتے ہیں

ماہِ محرم میں دیکھو چاند ہو مال آئیا
تارے گگن کے گوند کے سہرا جو شہ کوں لایا
کنگنا ستم کا باندھ کر رکھا اپٹنا کوں لگا
حیرت کی چوکی کے اوپر انجھواں سے تن نہلائیا

رنگینی اور شعریت کا رنگ کتنا گہرا ہے اور فنی لحاظ سے یہ شعر کس قدر خوبصورت ہیں۔ اس قسم کی صدہا مثالیں بکھری ہوئی ہیں جن کے بعد حامد حسن قادری اور دوسرے مورخین کا دکنی مرثیے کو نظر انداز کرنا کس قدر نامناسب ہے۔ ہماری نظم و نثر کا پہلا دور دکنی ہے معراج العاشقین اسی ادب کی نمائندگی کرتی ہے اس لیے معراج العاشقین کے بعد اور اس کے ساتھ جو شعری سرمایہ ہے اسے کسی طرح نظر انداز کرنا مناسب نہیں ان مرثیوں میں اسلوب بھی ہے اور جذبات۔ اسلوب کا سرسری تذکرہ کرنے کے بعد جذبات کا مطالعہ بھی کر لیجیے

جذبات:۔ خالص دکنی مخلوط اور صاف زبان میں مرثیہ لکھنے والوں میں فرق ہے خالص دکنی زباں سے ہم اچھی طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اسکے علاوہ انیس و دبیر کے تاثرات سے یک لخت دور ہونا بھی ہمارے بس کی بات نہیں مگر اصولی طور پر دیکھا جائے تو ماننا پڑیگا کہ اب سے تین ساڑھے تین سو برس پہلے یہ مرثیے کس

قدر جذبات انگیز ہوں گے۔ جن میں کہا گیا۔

اگارہ مہینے کے نمنے محرم نہیں ہے نوں ۔۔۔ سبھی مہینے میں خوشیں کرتے تو اب دیکھ بسایا ہے
کیا ہے مہمانی یوں اماماں کا محرم نوں ل ۔۔۔ جنگل میں کربلا کے سب بلایاں کو بلایا ہے
مسلماں کو نہیں ہے اس برابر کوئی بلا جگ میں ۔۔۔ کر انجھواں کے لہو سینیں پیالے بھر پلایا ہے
اماماں منجے سنگے مولاں سو شامی شومی کافر ۔۔۔ ہوئے بے قول تو ان میں خدا دوزخ بنایا ہے

(قطب شاہ)

ندیم کہتا ہے

ہے ہے اصغر ابن حسینؑ سونا تیرا پالنا ۔۔۔ رو رو بالو کرتی ہیں بین، سونا تیرا پالنا
تجھ بن جوگن کا کر بھیس، راکھ لگا سوں کھولے کیس ۔۔۔ تجکو ڈھونڈاں دلیس بدیس سونا تیرا پالنا
دکھ کی کنتھا پہنوں تن، غم کی دھونی جانوں من ۔۔۔ تجھ بن تجکو گھر ہے بن، سونا تیرا پالنا (۱)

(یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۶۷۹)

اظہار کی شدت، بین کی رقت اور سینہ زنی کا جوش دیکھیے۔ ہاشمی (متوفی ۱۱۰۹ھ) کہتا ہے

دل بندِ مصطفٰے کا تابوت لے چلے ہیں ۔۔۔ فرزندِ مرتضٰی کا تابوت لے چلے ہیں۔
سلطانِ دو جہاں کا تابوت لے چلے ہیں ۔۔۔ مظلوم کربلا کا تابوت لے چلے ہیں
حضرت کے ننھے نواسے حیدر کے تھے خلاصے ۔۔۔ ہوئے شہید پیاسے تابوت لے چلے ہیں

اے ہاشمی شہاں کا، سلطانِ دو جہاں کا
مقبول اس جواں کا تابوت لے چلے ہیں

صفائی، جوش، جذبات اور ابلاغ و اظہار کا یہ پیارا انداز بتا رہا تھا کہ فنی ارتقا قریب ہے، عوامی ذہن سامنے رکھ کر بین اور نوحہ کا اسلوب جاذبِ نظر اور کششِ دل کا باعث ہوا،

ملکی رجحانات کا اثر:۔ دکنی مرثیوں میں ملکی ماحول ماضی کے بجائے حال کو اپنے اندر سمیٹ لینے کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس سے عوام کی توجہ میں اضافہ ہوا، مرثیہ میں تازگی پیدا ہوئی اور شعر و شاعر کے مقاصد پورے ہونے لگے۔ ہاشم کے مرثیے سے تین شعر دیکھیے

بالے اصغر کے تئیں بلاتی رہی — سونا یہ پالنا جھلاتی رہی
تھا برس گانٹھ کا تجھے ارماں — لال جامہ ہنر اسے لاتی رہی
قاسم آیا ہے جب بھیانے کو — میں تماشا تجھے دکھاتی رہی

سیرت، مکالمہ و محاکات کے ابتدائی خاکے بھی ابھرے اس دور کے مراثی پر منظوم شہادت نامے اور مثنویاں بھی اثر انداز ہوئیں۔ بعض مرثیوں میں مختصر واقعات و روایات بھی مسلسل نظر آنے لگیں۔

نتیجہ: ۱۔ دکنی ادب کا مفصل مطالعہ بتاتا ہے کہ سولہویں صدی کے آخر میں مرثیہ گوئی عوامی سطح پر آچکی تھی

۲۔ اس عہد میں مرثیے کی ہیئت معین نہیں تھی۔ غزل، مثنوی، مثلث، مربع، مخمس، ترجیع اور مسدس شکل میں بے شمار مرثیے موجود ہیں۔

۳۔ مرثیہ کا مقصد متعین ہو چکا تھا۔ رونا، رلانا اور ماتم کرنا۔

۴۔ ابھی تک قصیدہ کا پیوند نہیں لگا تھا۔ تشبیب کی جگہ چہرہ ایجاد نہیں ہوا تھا

۵۔ یہ مرثیہ آج کے سلام، ماتم، نوحہ اور روایت کی ابتدائی صورت ہے۔

۶۔ عوامی لہجہ اور عوامی خطاب کے پیش نظر فنی باریکیاں پوری طرح ملحوظ نہیں تھیں

دہلی میں اکبر سے پہلے جذبات کی ترجمانی فارسی کی زبانی ہوتی تھی [۱]

دہلی میں مرثیہ عالمگیر اورنگ زیب کے بعد اردو کو شمالی ہند میں رواج عام سے زیادہ محبوبیت خواص کا شرف ملا۔ اب یہ اتفاق کی بات اور اردو کی خوش قسمتی تھی جو دکن کی پہلی نثری کتاب تصوف پر لکھی گئی اور "سب رس" کے نام سے مشہور ہوئی اور دہلی میں سب سے پہلی کتاب کربلا لکھی گئی جو "دہ مجلس" کہلائی۔ ملا فضلی نے مجلس امام حسین علیہ السلام کے لئے روضۃ الشہداء کے طرز پر دس مجلسوں کے مسودے لکھے۔ یہ مجالس نواب شرف علی خاں کے یہاں مجلسوں میں پڑھی گئیں اور اس قدر مقبول ہوئیں کہ مدت دراز تک لوگ اسی کتاب سے مجلسوں کو زینت دیتے رہے۔ اس کے بعد لوگوں نے اسی طرز پر مجلسیں لکھنا

۱۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر میں نے کچھ کام شروع کیا ہے انشاءاللہ بہت جلد نتیجہ جستجو پیش کروں گا۔

شروع کر دیں جسکا ایک مجموعہ گلِ مغفرت کے نام سے چھپ چکا ہے۔

ملا فضلی کی کتاب "کربل کتھا" ۱۹۶۵ء میں مالک رام اور مختار الدین صاحب نے ایڈٹ کر کے شائع کر دی ہے اور بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ مرتب نے کوشش کی ہے کہ کتاب کے تمام مضامین کی تردید کر دیں۔ گویا موصوف نے حواشی میں فضلی کی تقریروں کا جواب لکھ کر ایک مناظر کے فرائض انجام دیے ہیں۔ جو اصولِ ادب کے خلاف اور آداب تصحیح متن کے منافی ہے۔ فضلی نے ان مسودات میں نثر کے ساتھ نظم بھی لکھی ہے۔ یہ نظمیں سلام و مرثیہ کی قسم میں داخل ہیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ ملا فضلی شاعر بھی تھے اور انہوں نے مرثیے بھی لکھے ہوں گے۔ جناب مسعود حسن صاحب نے فرمایا ہے کہ ان کے پاس ملا فضلی کا ایک مرثیہ اور ان کے چھوٹے بھائی کرم علی کے کئی مرثیے موجود ہیں۔ یہ مرثیے ۱۱۴۰ھ کے لگ بھگ لکھے گئے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بارھویں صدی ہجری کے وسط میں دہلی میں مرثیہ نگاروں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔

اس زمانے میں دہلی کا عالم وہی تھا جو آج کل کراچی کا نقشہ ہے۔ مختلف نسلوں، مختلف علاقوں، رنگا رنگ خاندانوں کے افراد گلی گلی بازار بازار پھیلے ہوئے تھے۔ ایک گروہ کشمیریوں کا تھا۔ جنکی بول چال اور لہجہ پشاوری پٹھانوں کی گفتگو سے ملا ہوا تھا۔ دوسرا گروہ دکن والوں کا تھا جو راجپوتانہ کے جاٹوں سے الگ انداز میں بات چیت کرتے تھے۔ مارواڑی سندھی پنجابی، پشتو، برج بھاشا، پوربی اور برج بھاشا جن لوگوں کی مادری زبان تھی۔ جب آپس میں گفتگو کرتے تھے۔ تو کچھ عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ انشا نے اپنی "دریائے لطافت" میں ان مناظر کی تصویریں پیش کی ہیں اس پس منظر میں ہمارے بعض مسائل حل ہوتے ہیں۔ مثلاً مجالس میں دکنی مرثیوں کا پڑھا جانا۔ ملتانی اور کشمیری منظومات مراثی کا مقبول ہونا۔ انشا کہتے ہیں کہ:

"سعد اللہ سکندر، مرثیہ گو نے ہر زبان میں مرثیے کہے ہیں چنانچہ مارواڑی بولی کہا، جس کے اول بند کا اوّل مصرع یہ ہے:

"رکائیں کہی اب مہا کو شابان گھنی کٹک پڑھ دہائی چھیے۔"[1]

تذکروں کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں بعض مرثیہ گو دہلی سے دکن بھی گئے ہیں اور لکھنؤ بھی۔ سودا، جرأت، میر وغیرہ کے مرثیے اسی عہد کے اسلوب کی نمائندگی کرتے ہیں۔

نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں سالار جنگ[2] ۱۱۵۱ھ میں دہلی آئے تو انہوں نے متعدد امام باڑے دیکھے اور یہاں کے چند مرثیہ گو اور مرثیہ خوانوں کو سنا جن میں جاوید خان کے عاشور خانہ میں ان کے مرثیے سنے جو محتشم اور حسن کاشی کی تکرار کرتے تھے۔ ان کے علاوہ تین مرثیہ گو بھائیوں کے نام بھی لئے ہیں مسکین، حزیں،[3] غمگین اور ایک شاعر محمد نعیم کا ذکر بھی کیا ہے میر عبداللہ، میر ابو تراب، مرزا ابراہیم، میر درویش، جانی حجام کی مرثیہ خوانی کی تعریف اس انداز سے کی ہے جیسے آج کل کے کسی سوز خواں کی مدح کی جاتی ہے۔ مرقع دہلی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ موسیقار حسن اور گلو بازوں کے ذریعے سامعہ نواز ہوتا تھا۔

دہلی کے علاوہ فرخ آباد، کالپی، مرشد آباد، عظیم آباد وغیرہ میں بھی ہندو مسلمان مرثیے کہتے تھے۔ یہ مراثی ابھی تک معین ہیئت میں نہیں تھے۔ مگر غزل نما اشعار فضائل و مصائب کو "سلام" کا نام دیا جا چکا تھا۔

---

[1] ترجمہ دیباچہ لطائف غالب، انجمن ترقی اردو طبع ۱۹۲۶ء ص ۵۔

[2] نواب سالار جنگ اوّل متوفی ۱۱۸۰ھ خود بھی مرثیہ گو تھے۔ ان کا کلام بھی متفرق طور پر چھپ چکا ہے اور ان کا امام باڑہ اب تک حیدر آباد میں موجود ہے۔ حیدر آباد کا مشہور سالار جنگی خاندان اب تک شیعہ ہے۔ (مرتضیٰ حسین عفی عنہ)

[3] ایک حزیں کے بعض مراثی میرے پاس ہیں اب نہیں معلوم کہ وہ میر محمد باقر حزیں ہیں یا محمد علی حزیں۔ دیکھئے مخزن نکات، نکات الشعرا، تذکرہ شعرا، گردیزی، مجموعہ نغز

گویا دکنی مرثیہ نے مسدس کی شکل میں کچھ ٹھہراؤ پایا ہے اور نئے شاعر جیسے خلیق، فصیح، ضمیر وغیرہ کے شباب تک دوسری ہیئتیں تقریباً ختم ہوکر مسدس ہی باقی رہ گیا۔

لکھنؤ میں مرثیہ گوئی: فیض آباد اور لکھنؤ میں مرثیہ کا تیسرا دور شروع ہوا۔ یہاں مرثیے کی ہیئت کے ساتھ ساتھ مادے اور تکنیک میں تبدیلیاں ہونے لگیں۔ دلگیر، ضمیر، دبیر بلکہ خلیق نے بھی مرثیے میں مسدس کی ہیئت کو اپنایا اور اس میں قصیدے کا پیوند لگایا۔ یعنی چہرہ، جنگ اور مصائب۔ بین وغیرہ کا اضافہ کیا۔ ضمیر و دبیر و انیس نے فنی باریکیاں بھی ملحوظ رکھیں۔ منظر نگاری محاکات گریز، رجز، جنگ شہادت، در جذبات کی ترجمانی پر زور دیا۔ ساقی نامہ بھی آیا اور سیرت نگاری، یہ اسلوب نفیس، تعشق، اوج، رشید وغیرہم نے اور زیادہ اجاگر کیا اور اب مرثیے کی ہیئت بھی منضبط ہوگئی اجزائے ترکیبی قائم ہو گئے اور مرثیہ وہ نظم کہی جانے لگی جو مسدس ہو۔ اور چہرے سے بین تک کم و بیش تمام اجزا پر مشتمل ہو۔ ورنہ سلام، نوحہ، ماتم، روایت، سوز وغیرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مرثیہ بشکل مسدس کی گنجائش، پہنائی اور مقبولیت کو دیکھ کر چکبست اور حالی وغیرہم نے اسے امام حسین علیہ السلام اور کربلا کے علاوہ دوسرے المیہ واقعات کے لئے استعمال کیا مگر اصطلاحِ ادب و تنقید میں ان منظومات کو بہت کم اہمیت دی گئی۔ کیونکہ ان کا مقابلہ انیس و دبیر رحمہما اللہ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ انیس و دبیر کے معین کردہ راستے میں جناب نفیس، مرزا محمد جعفر اوج، جناب عروج و عارف، جناب مرزا محمد طاہر رفیع مرحومین نے بہت سی منزلیں متعین کیں کسی نے بہار پر زور دیا کسی نے جوانی اور بڑھاپے کو موضوع بنایا۔ کوئی رجز اور ساقی نامے پیش کرتا رہا۔ کسی نے بین اور شہادت لکھنے میں مقابلے کئے۔ اس دور میں فن نے پختگی اور مرثیے نے اپنی موجودہ حالت کو انتہا تک پہنچتے دیکھا۔

لکھنؤ ہی پر موقوف نہیں پورے برصغیر میں مرثیہ گو پھیل گئے اور ہر ایک نے

اپنی بساط بھر خوب مرثیے لکھے مگر حضرت انیس اور جناب دبیر سب کے لیے مثال تھے۔ وہی حدیں اور وہی آداب سب نے ملحوظ رکھے۔

مرثیہ میں پیام: مرثیے کا طویل مطالعہ بتاتا ہے کہ شروع سے اب تک مرثیے کا ایک ہی مقصد تھا۔ رونا اور رلانا عزائے امام حسینؑ قائم کرنا۔ بہت آگے بڑھے تو فضائلِ اہلبیتؑ کی اشاعت اور اس کے بعد کردارِ شہدائے کربلا کا بیان۔

۱۹۳۹ء/۱۳۵۸ھ میں لکھنؤ کا تحفظِ حیثیت کے لیے مشہور ایجی ٹیشن ہوا۔ اس ایجی ٹیشن نے شیعوں کو نئی طاقتوں سے آشنا اور نئی ضرورتوں سے باخبر کیا، وہ دبے دبے خیالات جو کبھی سیاسی یا سماجی جلسوں میں ظاہر کیے جاتے تھے۔ قومی پلیٹ فارم پر اصلاح و ترقی کے جو نعرے لگتے تھے۔ ایجی ٹیشن کے چار پانچ ماہ میں شیعوں کا روزمرہ ہو گئے۔ اب نوحہ و سلام رباعی و قصیدہ میں ایک خاص رجحان ظاہر ہوا، خاص فکر کی تحریک نے جنم لیا۔ اسے "بیداری"۔ بلند کرداری" اور سوانحۂ کربلا سے کیا ملا" سے تعبیر کیجیے۔ لکھنو اور بیرون لکھنؤ کے شعراء نے نوحوں میں تبلیغ شروع کی جن کے سربراہ نجم آفندی قرار پائے ان کی آواز میں گونج اور ان کے نوحوں میں للکار تھی۔ فضل لکھنوی اور نرتم رودولوی نے اس اندازِ فکر کو آگے بڑھایا۔ اور گروہ در گروہ شعرا اس راہ پر چلنے لگے۔ ابھی اس بات کو سال بھی نہ گذرا تھا کہ یادگارِ حسینی کی تحریک شروع ہوئی اور کھلے اسٹیج پر مختلف قوموں کے سامنے واقعات بیان کیے گئے۔ اس کے فلسفے پر گفتگو ہوئی۔ مختلف مذہبوں کے مفکرین نے شہادتِ امام حسینؑ پر اپنے اپنے زاویۂ نظر سے تقریریں کیں اور مقالے لکھے۔ سیاسی، ادبی، اور تاریخی شخصیتوں نے امام حسینؑ کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ شاعروں نے نظمیں لکھیں اور مصنفوں نے کتابیں۔ ملک گیر اجتماعات نے ذہنی فضا بدل دی سب کو خیال ہوا کہ نئے تقاضوں کے مطابق پرانے اسالیب بدلنا ضروری ہیں، ترقی کی رو جو آہستہ آہستہ اپنا راستہ بنا رہی تھی اب ایک دھارا بن گئی تھی

جوش ملیح آبادی، اس وقت "شاعر انقلاب" ہی کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ ان کی سیاسی و ادبی حیثیت سے ہر شخص متاثر تھا۔ حسین اور انقلاب" کے عنوان سے جو مرثیہ پڑھا تو ہلچل مچ گئی، جوش، انقلاب، بغاوت، آزادی اور نہ معلوم کون کون سی اصطلاحیں اور تصورات زیر قلم آ گئے۔ ناظم صاحب کا امام باڑہ کھچا کھچ بھرا ہوا، باہر سڑک پر بھی مجلس ختم ہوئی تو بیتیں اور مصرعے شہر بھر میں زبان زد تھے۔

عباس نامور کے لہو سے دھلا ہوا
اب تک حسینیت کا علم ہے کھلا ہوا

اصغر کو پیچ و تاب، نہ تھا اضطراب کا
وہ دل دھڑک رہا تھا رسالت مآب کا

ان شعروں پر قیامت کا گویا

آلِ رضا کا نو تصنیف مرثیہ ... زمانے کے ... فکر، تعلیم یافتہ، نئی تہذیب و ماحول کے پروردہ سید

آل رضا وکیل، شعر و غزل میں اچھا مقام رکھتے تھے۔ سید صاحب طبعاً لکھنؤ کی نفاست و تہذیب کے پرستار، لکھنوی زبان و احتیاط کے پابند، قانون و مذہب کا احترام کرنے والے تھے۔ آرزو لکھنوی کے شاگرد اور عزیز لکھنوی کے قدردانوں تھے۔ لہٰذا ان کے شعر میں جوش کے لہجے نے عزیز کا تیور اور زبان نے آرزو کا لوچ اپنا لیا۔ انقلابی ادب، مرثیہ کی روح کا احترام ہی ہے جو آل رضا کو معاصر مرثیہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔

معاصر مرثیہ گویوں میں نسیم امروہوی کا نام ضرور لیا جائے گا۔ انہوں نے انیس و دبیر کے ڈھانچے میں تبدیلی کیے بغیر ان کی زبان اور ان کے اسلوب کو بڑی ترقی دی ہے۔ نسیم کو روایتی مرثیہ پر بہت اقتدار حاصل ہے۔ زبان، فنی مہارت اور استادانہ ذہانت متعلقہ مباحث سے براہ راست واقفیت نسیم کے خصوصیات میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ موصوف نے مرثیہ کو اپنا فن اور

قابلِ فخر مشغلہ قرار دیا ہے۔ ان کا مرثیہ کلاسیکی مرثیوں کی تمام خوبیوں کا حامل ہے۔ نسیم مرثیہ کے روایتی اوصاف وحدود کے سختی سے پابند ہیں۔ انکے یہاں پیام اور عصری فلسفہ نہیں ملتا۔ میرے خیال میں دعوتِ اصلاحِ کردار انقلاب آفرینی، فلسفہ، تاریخ وتمدن، جہاد کی تیاری جیسے موضوعاتِ مرثیہ میں لائے تو جا سکتے ہیں مگر یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس سے مرثیہ کا موضوع کربلا اور واقعۂ کربلا، اور اس کا مجلس سے خاص لگاؤ بجائی رشتہ دب نہ جائے انسے ضمنی حیثیت نہ حاصل ہونے پائے ورنہ مرثیہ، مسدس ہو جائیگا قومی نظم کہلائے گا اسے مرثیہ کہنا درست نہ ہوگا۔ نہ اسے مجلس میں پڑھنا مناسب ہے۔ اردو نظم کے قیمتی سرمایے کو دیکھ کر کہتا ہوں کہ واقعۂ کربلا پر مرثیوں کا ذخیرہ نہ صرف ہمارے شعری ادب کی متاعِ گراں بہا ہے بلکہ ہمارے شعرا کی محنت و آبرو بھی ہے۔ اس سے بہتر وجامع صنفِ سخن اردو میں کوئی نہیں۔ ہماری تاریخ، تہذیب، زبان اور جذبات اور فکر کا آغاز وارتقا مرثیوں کے خزانے میں محفوظ ہے۔ اور ہمیشہ اس میں ترقی ہوتی رہی ہیں دبیر و انیس کے احترامات کو محفوظ رکھتے ہوئے یہ کہنے میں باک نہیں رکھتا کہ مرثیے کی روایت ان کے بعد بھی برگ وثمر لائی یہ دوسری بات ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے سدا بہار چمن کو دیکھ کر گل گشتِ چمن کی ضرورت نہ سمجھی جائے۔ بات ہے مزاج کی، اگر غزل کو تصوف کا باب بنا دیا جائے یا قصیدے کو تاریخ کا دفتر کردیں تو لکھنے والے کا قلم کون روک سکے گا۔ ہاں اُسے ٹوکا ضرور جائے گا۔ مرثیہ مذہبی اور ادبی تقدس ہی نہیں رکھتا کہ میں کہہ دوں۔ اِس میں سیاست نہ لائیے اور فلسفہ نہ بیان کیجیے۔ بلکہ مرثیہ کا ایک مقصد اور بھی ہے۔ یعنی۔ مرثیہ ذریعۂ اظہارِ عقیدت ہے۔ مرثیہ بلندی کشش جذب و خلوص ہے۔ مرثیہ آہ اور اشکوں کا مطالبہ ہے۔ مرثیہ لطیف انسانی ہمدردی وایثار و قربانی کے جذبات کی تحریک ہے۔ لیکن دین اور اللہم حسینؑ

کے حوالے سے مرثیہ جس پاکیزہ ماحول، شفاف فضا اور عمدہ مجلس میں پیش
کیا جاتا ہے اسے سیاسی اسٹیج اور سائنسی تجربہ گاہ سے کوئی نسبت
نہیں۔ میں مرثیہ میں تنوع کا حامی ہوں نئے تجربے کیے جائیں لیکن اس
نکتہ کہ روح اور مزاج مرثیہ کو مجروح ہونے سے محفوظ رکھ کر نفاست
اظہار، اور ابلاغ کی لطافت لہجہ اور آہنگ کی پاکیزگی ہاتھ سے نہ جانے
پائے چہرہ ہو، شہادت ہو، چہرے سے رجز تک اجزا بدلنا ضروری
ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مقامے دارد، شاعر اپنی
پسند کے مطابق اظہار کا پیرایہ کیوں نہ اختیار کرے۔ مگر اسے اتنی پابندی
ضرور قبول کرنا چاہیے کہ اجزائے ترکیبی بدلنے کے ساتھ فضا نہ بدل دے
ہیئت کی تبدیلی سے مرثیت پر زد نہ پڑے کیوں کہ جب ہیئت، اجزا و
ترکیب اور مزاج و روح سب کچھ بدل جائے گا۔ تو وہ مرثیہ
نہیں رہے گا۔

زیر نظر مرثیہ

"اسلام دینِ عظمتِ انسان ہے دوستو"

آلِ رضا صاحب کا یہ مرثیہ ایک سو چھبیس بندوں پر مشتمل ہے
موصوف نے یہ مرثیہ کراچی میں لکھا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد مرثیہ کی ترقی
کا نیا باب کراچی سے شروع ہوتا ہے۔ ذوالفقار علی صاحب بخاری نے
۱۹۴۷ء سے تحت اللفظ کا نیا تعارف کرایا۔ برصغیر کے بڑے بڑے
مرثیہ گو یہاں جمع ہو گئے اور معرکے کی مجلسیں قائم ہوئیں۔ نئی روایت
کے شاعر اور پرانے اسلوب کے اساتذہ نے مرثیہ پر توجہ کی اور فن
بڑھنے لگا۔ اسی فضا میں آلِ رضا صاحب نے یہ مرثیہ تصنیف کیا
میں نے پورا مرثیہ پڑھ کر محسوس کیا کہ سید صاحب کو جو قدرت کلام حاصل
ہے وہ اس کے سہارے معتدل انداز میں فکری حرکت اور نفسیاتی تاثرات

کو ابھارنا چاہتے ہیں۔ وہ آج کی نسل اور نئے ذہنوں کو واقعۂ کربلا کے زندگی و تابندگی سے بھرپور اثرات منتقل کرنے کے آرزومند ہیں۔ وہ سب سے کہتے ہیں کہ اس مینارِ نور سے روشنی حاصل کریں۔ وہ امام حسینؑ اور اسلام۔ اسلام اور کردار کے باہمی رشتوں پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور اس کے نتائج کی تفصیل و توضیح سمجھاتے ہیں۔ سطریں دیکھیے، کس لطافت سے اسلامی

اسلام دینِ عظمتِ انساں ہے دوستو   اسلام کُنہ نفس کا عرفاں ہے دوستو
اسلام، نظمِ غیب پر ایماں ہے دوستو   اسلام، صرف حکمتِ قرآں ہے دوستو

قرآں سے جو نسبت عقلِ سلیم ہے
کہنا پڑے گا خلقتِ انساں عظیم ہے

اس کے بعد انسان اور انسانیت۔ انسان کا عمل۔ تخلیق کا مقصد اور اس میں گریز کا یہ بند:

ہوں خوب روز روز زمانے میں تجربے   نکلیں تصرفات کے پہلو نئے نئے
یہ فیصلہ اٹل ہے کہ اتنی سمجھ رہے   کس وقت کون چیز ہے کس کام کیلئے

حسبِ محل تعینِ اقدار چاہیئے
تشخیصِ حسن و قبح کا معیار چاہیئے

چودھواں بند اور اس کی بیت:

دل جگمگا دیئے ہیں دماغوں کے ساتھ ساتھ
روشن کیا ہوا کو چراغوں کے ساتھ ساتھ

پھر سترھویں بند کی خوبصورت و معنی آفریں بیت بھی دیکھیے

تسخیرِ کائنات کی قدرت لیے ہوئے   خالق کی بارگاہ میں سر خم کیے ہوئے

تحریکِ زندگی میں بصد اہتمام ہے   وہ قوتِ نمو حرکت جس کا نام ہے
قطعِ جمود و ناز لیت کی سعی دوام ہے   تدوینِ ارتقا کا یہی انتظام ہے

-۸

مذہب وہی جو خوبیِ فطرت کا ساتھ دے
ملت وہی، جو حسنِ طبیعت کا ساتھ دے

پھر اسلام کے اوصاف، اور توحید کا بیان ہے، انسانی احساسات میں غیر معتدل رجحانات کی نشاندہی کرنے کے بعد کتنا اعلیٰ درجے کا بند لکھا ہے

ظاہر ہوا کمال بشر یہ بھی گاہ گاہ — کر سکتا ہے مگر نہیں کرتا کوئی گناہ
تھی جو یہ کمی، تو یہ حجت تھی بے پناہ — مجبورِ معصیت ہے ہر انسان خدا گواہ
یہ کون مانتا کہ مری کچھ خطا بھی ہے — عصیاں فریبیوں کی کوئی انتہا بھی ہے

یہاں سے آل محمدؐ اور کربلا کی بات شروع ہوتی ہے، حضرات انبیاء و ائمہ کے صفات و کردار کے سلسلے میں حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کا واقعہ لکھتے ہوئے کہا ہے۔

کی، اور خدا نے اس کی حفاظت ضرور کی — قرآں میں جو ذکر ہے، مجلس میں بھی وہی
اس ابتدا کی حسبِ طلب انتہا جو تھی — کعبہ سے واقعات کی رو کربلا چلی
اس راہ میں جو آئے وہی دن عظیم ہے — صدیوں کے بعد منزلِ ذبحِ عظیم ہے
یہ عظیم دن اور راستے طے کرتے کرتے۔

محراب مشہدِ شہِ دیں کی گواہ تھی — اسلام پر یہ ضرب بڑی بے پناہ تھی
پھر امام حسینؑ پر ایک بند لکھنے کے بعد

حجت تمام کر کے امامت نے دی صدا — اب تو ہے ہم کو صرف شریعت سے واسطہ
لے جاؤ اپنا ناقہ زخمی شکستہ پا — اس کا جواب زہر سے چھپ کر دیا گیا
باقی جو حوصلے تھے وہ کھل کر نکل گئے — حد ہو گئی کہ تیر جنازے پہ چل گئے

بند نمبر ۴۸

اسلام نے دکھایا تھا انساں کا جو کمال — کرتے ہیں اب اسی کو مسلماں پائمال
جورِ منافقت نے کیا یوں تباہ حال — عظمت کا چل چلاؤ، طبیعت بہت نڈھال
آواز دی ہے فاطمہؑ کے نورِ عین کو — انسانیت پکار رہی ہے حسینؑ کو:

یہاں سے مرثیہ کا تقدس پوری طرح ابھرتا ہے۔ جدت بھی ہے اور رکھ رکھاؤ بھی۔ اس کا فنکارانہ رونے رلانے کا مقصد، جذبات کا توازن اور اس کی فضا کا احترام سامنے آتا ہے۔ سویں بند پر تو پہنچ کر شاعر کھلم کھلا دعوتِ گریہ دیتا ہے۔

اس قافلے میں ایک مسافر ہے شیر خوار میدان کے لئے یہ سپاہی ہے بے قرار
جلدی چلو، کہ ہوتی ہے تاخیر ناگوار منظور اس کی عمر کو بے حد ہے انتصار
پہنچا دو اپنے وقت سے اس ناتواں کو کوہ گراں اٹھاتا ہے ننھی سی جان کو

درحقیقت یہاں سے مرثیہ خالص عزائی آہنگ ہے جس اہتمام کے ساتھ پھیلا ہے وہی اس کی جان ہے اور اسی سے اس مسدس نے مرثیہ کا مزاج مکمل کیا ہے بے شک اس میں ساقی نامہ، تلوار، گھوڑا، رجز، جنگ اور شہادت کی تفصیل نہیں مگر بندوں کا درجہ بدرجہ آگے بڑھنا، تاثر کا گہرا اور دردانگیز ہونا ہی تو مرثیہ کی جان ہے۔ سن کر دل پر چوٹ لگے۔ آنکھوں سے آنسو نکلیں، فکر و نظر کو روشنی حاصل ہو، اور مقصد آفرین تمہید یا چہرے میں واقعۂ کربلا کے جزئیات درسِ حیات اور تعمیر کردار، صیقلِ قلب و بصیرت کا سبب بنے۔ فقط منعرے خشک فلسفہ، بے اثر وعظ، بے ربط افکار سے منبر کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ آل رضا کے مرثیوں میں یہ کمزوری نہیں ہے۔ اسی بنا پر نئے تجربوں میں آل رضا کا مسدس مرثیہ ہی رہا ہے۔

اگر مرثیے میں اپنی روایت کا احترام برقرار رکھتے ہوئے جو آزمائی کی گئی اور مرثیہ کو دین سے اور دین کو امام حسین علیہ السلام سے استوار رکھا گیا۔ اگر سیاسی پیام اور فلسفیانہ نظم کو مرثیہ پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کی گئی تو آل رضا کے مرثیے نئی پود کے لئے یقیناً راستہ ہموار کر رہے ہیں مقصدیت پیام، تجزیہ اور استنتاج کا یہ معتدل امتزاج مرثیے کے حدود میں ایک دوسری وسعت کی نشاندہی ہے۔ جسے آنے والی نسلیں شمع راہ بنا سکیں گی

اور مرثیہ کا چوتھا باب شروع ہوگا یعنی "مرثیہ، پاکستان میں" اور یہ باب مرثیے کے لیے تابناک مستقبل کی طرف لے جائے گا۔

انساں کا یہ مرقعِ عظمت ہے یادگار   سجدے پہ افتخار، شہادت پہ اعتبار
دہرے شرف ہیں ایک سے ہے ایک ذی وقار   دل پر وہ اقتدار کہ عالم پر اختیار

دونوں پہ ایک ساتھ حکومت حسینؑ کی
سجدہ حسینؑ کا ہے، شہادت حسینؑ کی

آغا سکندر مہدی کا ایک مرثیہ

مرثیہ، عربی، فارسی، اور اردو ہی میں نہیں بلکہ ہماری مقامی زبانوں میں
بھی اعلیٰ درجے کی صنفِ شعر ہے۔ ہماری قومی زبان کی تو ابتدا مرثیہ ہی سے
شروع ہوتی ہے اور اس کے ادبِ عالیہ میں بلند ترین ادب اگر کہیں ملتا ہے
تو مرثیہ ہے۔ تاجدارِ دکن قطب شاہ سے سلطانِ فن حضرت انیس تک
الہامی ادب کا یہ حصہ مسلسل ترقی کرتا چلا گیا ہے۔ دکن کے سینکڑوں شاعروں
کے مرثیے ہماری ادبی تاریخ کا گراں بہا خزانہ ہیں۔ میں اپنی کتاب "قدیم تاریخ
عزاداری" اور متعدد مقالات میں اس موضوع پر بار بار لکھ چکا ہوں
دکنی دور کے بعد دہلی اور لکھنؤ میں بکثرت مرثیہ گو پیدا ہوئے (ریاض تذکرہ
مرثیہ گویاں) وجہی، نصرتی، ولی، میر، سودا، جرأت، حسرت، مسکین، گدا
سکندر، میر حسن کے بعد مرثیہ کی ہیئت اور تکنیک میں تبدیلیاں کی گئیں یا
اس کے خد و خال متعین ہوئے۔ ضمیر، فصیح، خلیق نے جم کر ایک خاکہ
پر طبع آزمائی کی، اسے نیا رنگ دیا، اور مرثیہ کو ماتم یا بین سے نکال
کر شان و شوکت، قوت و حرارت، فکر و فن کے نئے خلعت پہنائے
انیس و دبیر نے متقدمین اس کے تجربے کو آخری صورت بخشی اور مرثیہ
ایک صدی کے اندر اندر اپنے انتہائی نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔

انیس و دبیر کے بعد عشق و تعشق، نفیس، اوج و عروج و رشید
اور ان بزرگوں کے معاصر حضرات نے کوششیں کر کے بہت سے
نئے پہلو نکالے، مگر انیس و دبیر نے جو خط کھینچا، مرثیہ کی، جو حدیں
مقرر کیں وہ پتھر کی لکیر بن گئیں اور آج تک کمال مرثیہ یہی نقطۂ آخر سمجھا
جاتا ہے۔ اوج و عروج کے بعد رشید اور رشید کے بعد ربع
صدی ایسی گذری جس میں ان کے جانشین ندرت اظہار کے مقابلے کرتے

رہا ہے۔ مگر نئی راہ نہ نکال سکے۔ جنگِ عظیم کے بعد لکھنؤ کے دلبستان میں نئی تحریکیں زور پکڑتی گئیں۔ صفی و عزیز کی زیرِ سرکردگی، شعر میں قافیت کا شعوری نقطہ پھیلا مطالبہ و مباحثہ کے تجربوں کے فوائد واضح کئے اور دوسرے شعرا کی طرح مرثیہ میں نئی زندگی کی روشنی آئی پرانوں کے مقابلے میں بالکل نئے اور نوآموز شاعروں کی نسبت سے پرانوں نے مرثیہ کو فلسفہ دیا۔ حکیم آشفتہ مرحوم، جناب نجیب، جناب نسیم امروہوی، نجم آفندی، رزم ردولوی جیسے متعدد حضرات سامنے آئے۔ لیکن جنابِ آلِ رضا صاحب اور جناب جوش ملیح آبادی نے ایک نئے تیور سے مرثیہ لکھا۔ للکار، فکر انگیزی، خیالات کا تسلسل فلسفہ کی تشریح اور عمل کی دعوت اِن کے فن کا مدعا تھی۔ ملک و ملت کے حالات علم و عمل کے پھیلاؤ۔ نئی نسل کے ابھرتے تقاضوں نے اس انداز کو پسند کیا اور مرثیہ نگاری کے فن نے دوسری کروٹ لی۔ ظاہر ہے کہ فنی مرثیہ معیاری شاعری سے اونچے درجہ کی چیز ہے۔ مرثیہ نگار کو مرثیہ لکھنے سے پہلے غزل، قصیدہ، رباعی بلکہ مثنوی و نظم میں مشق و مہارت حاصل کرنا پڑتی ہے۔ غزل خود مشکل ترین صنفِ سخن ہے۔ اچھی غزل اچھا شاعر کہہ سکتا ہے مگر معیاری اور رنگ سک سے درست، فنی ترکیبوں سے آراستہ اور صحیح معنوں میں غزل کہنا آسان نہیں۔ فنی لحاظ سے اعلیٰ درجہ کا قصیدہ بڑی جگر کاوی اور بڑی استادی کا کام ہے۔ شاعر جب ان مرحلوں سے گذر کر ان آنچوں سے نکل کر طبیعت کو کندن اور شعر کو جلا دینے کی صلاحیتیں حاصل کر لیتا ہے تب جا کر مرثیہ گوئی کی سرحد میں داخل ہوتا ہے۔ پھر اسے تمام اصناف سے رخ موڑنا اور تمام اقسام شعر سے رشتہ توڑنا پڑتا ہے۔ مرثیہ، یکسوئی چاہتا ہے، مرثیہ کے لئے محنت درکار ہے۔ مرثیہ فن بھی ہے۔

ارتقائے فن بھی ہے۔ مرثیہ راستہ بھی ہے اور منزل بھی مرثیہ ایک طرف فن کاری نادرہ کاری کا آئینہ ہے اور دوسری طرف خود ایک مقصد بھی ہے۔ جو شاعر جلا سازی، نگینہ، تراشی اور مرصع کاری کی مشق کرتے ہیں۔ ان کی محنتوں کا حاصل کچھ اور ہے۔ اور جو مرثیہ کو مقصد سمجھ کر سادگی، بیان غم اہل بیت علیہم السلام اور عبادت کے زاویے سے مرثیہ لکھتے ہیں۔ ان کا انداز کچھ اور ہوتا ہے۔ وہ مجلس اور نیت مجلس کو سامنے رکھتے ہیں۔ وہ اسے ثواب کا کام سمجھتے ہیں۔ وہ اس کا صلہ خدا سے چاہتے ہیں، شہرت و نمود سے بچتے اور خوشنودی خدا اور رسول جان کر مرثیہ کہتے ہیں۔ ان کے سامنے واقعہ کربلا کا دینی پہلو ہوتا ہے۔ وہ رونے رلانے کو باعث شرف جانتے ہیں۔ ایسے باخدا لوگ بہت ہیں خصوصاً مرثیہ نگاری کی فہرست میں ان سب لوگوں کے نام ہیں۔ جن کی نیت ثواب اور ذکر غم حضرت سید الشہدا علیہ السلام کا ہے،

جناب آغا سکندر مہدی شہر دانش و بینش لکھنؤ کے ماحول میں پروان چڑھے ان کا وطن رائے بریلی بھی گویا لکھنؤ کا ایک محلہ تھا جس کے تمام مذہبی و ثقافتی رشتے لکھنؤ ہی سے مربوط تھے۔ آغا سکندر مہدی صاحب نے بچپنے ہی۔ اپنے وطن میں بہتر سے بہتر مرثیہ گو اور مرثیہ خوانوں کو سنا۔ لکھنؤ میں شیعہ کالج ان کی تعلیم کا سرچشمہ تھا۔ وہ یہاں کے ہونہار، جواں ہمت اور باعمل طالب علم تھے۔ انہیں ادب مذہب سے محبت ورثہ میں ملی وہ کالج میں مقرر اور اچھے کھلاڑی کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ پاکستان آگئے۔ لیکن ان کے جبلی اور فطری رجحانات برقرار رہے۔ ان کے ادبی ذوق میں عمر کے ساتھ پختگی اور ان کے جذبات دیانت میں بلندی پیدا ہوتی رہی آخر ذوق و مذہب نے شعری راہوں میں مرثیہ کی منزل تلاش کی ان کے سفر کی ایک منزل ہمارے

سامنے ہے۔ آغا سکندر مہدی کا یہ تازہ مرثیہ پچاس بندوں پر مشتمل ہے
اس کا مطلع ہے:
غصۂ حر کا، طمانچہ تھا بہ رخسارِ یزید۔ دس بند شاعر سے متعلق ہیں
پندرہ بند نعتِ پیغمبرؐ میں ہیں۔ آخری بند سے گریز ہے۔ کہ حضورؐ کی تعلیمات سے

ٹھوکریں کھانے لگا جا بجا، عفریتِ غرور
حق کے آنے سے ہوئی ظلمتِ باطل کافور
دم بخود ہر جگہ یہاں تھا پرانا دستور
دین کی ترویج سے روشن ہوا انساں کا شعور
نفسِ امارہ سے جو برسرِ پیکار ہوا
حق کی نظروں میں وہی صاحبِ کردار ہوا

اور پھر صاحبِ کردار حرؑ کی روشن ضمیری، جرأت،
حق پرستی اور عرفانی قوتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے

نورِ حق دل میں لئے حر سوئے شبیرؑ چلا
بخشوانے کے لئے شاہ سے تقصیر چلا
ہاتھ رومال سے باندھے ہوئے دلگیر چلا
زیرِ لب پڑھتا ہوا آیتِ تطہیر چلا
جذبۂ عشقِ حقیقی نے ابھارا اس کو
مل گیا سورۂ توبہ کا سہارا اس کو

حرؑ کی آمد، معافی، اذنِ جہاد کا تذکرہ کرتے ہوئے، جنگ، تلوار
اور شہادت کے مناظر بڑی سادگی سے لکھ کر اس بند پر مرثیہ
ختم کیا ہے۔

لاشۂ حر پہ جو سرور نے بہائے آنسو
دیکھنے والوں کی آنکھوں میں بھر آئے آنسو

چشمِ خورشید نے پلکوں سے اٹھائے آنسو
مرنے والے نے کلیجہ سے لگائے آنسو
حُر کا اخلاص تھا، اعمال جو مقبول ہوئے
اشک معصوم کے میت کے لئے پھول ہوئے

مجموعی طور سے یہ مرثیہ آغا صاحب کے جذبۂ محبت حُر کا آئینہ ہے وہ جس کے لئے آغا صاحب نے کہا ہے۔

ذہن فنکار میں جس وقت بکھرتے ہیں نقوش
صورتِ گیسوئے خمدار سنورتے ہیں نقوش
نقد کی آنچ سے سو بار گذرتے ہیں نقوش
تب کہیں تاج محل بن کے ابھرتے ہیں نقوش
عظمتِ فکر رہی، خاک کا پیکر نہ رہا
آئینہ رہ گیا دنیا میں سکندر نہ رہا

میرے خیال میں آغا صاحب زود گو اور تیز نویس شاعر ہیں۔ انہوں نے بہت مختصر سی مدت میں پانچ مرثیے لکھ کر اپنی رسا کی اور بلند پروازی کا ثبوت دیا ہے۔ انہیں شعر پر قدرت ہے۔ انکا ذوق لطیف اور مطالعہ بھی اچھا ہے۔ وہ روایت کو پسند کرتے ہیں۔ زیرِ نظر مرثیہ میں فن کی قدیم روایت کا عکس ہے۔ انیس و دبیر کی شاہراہ پر چلنا جس قدر آسان ہے اس سے زیادہ محنت طلب اور دشوار بھی ہے۔ مرثیہ کی یہ شاہراہ ایک صدی سے قافلوں کی گذر گاہ ہے۔ بے شمار مرثیہ گو اس راستے پر آئے سینکڑوں شاعروں نے ہیئت و اسلوب کو سرمشق سخن قرار دیا۔ اور سب ماجور و مثاب ہوئے مرثیہ کی اصل غرض و غایت ثواب و خوشنودی خدا ہے۔ مرثیہ گو کے مخاطب خاص مزاج رکھتے ہیں۔ اس لئے شاعر ان کو سامنے رکھتا ہے

وہ مجلس میں فضائل و مصائب بیان کرتا ہے۔ خود روتا اور دوسروں کو رلاتا ہے۔ مجلس اور ذکر کے سامنے رضائے خدا، عبادت کا عمل اور کربلا کا تذکرہ ہوتا ہے۔ وہ جذبۂ ایمان کو ابھارتا، اصولِ اخلاق کو روشن کرتا اور سیرت شہدائے کربلا کی یاد دلا کر اہلِ مجلس کو مالِ مجلس سے بہرہ ور کرتا ہے، حاضرین مجلس اپنے اپنے ذوق و معیار کے مطابق مرثیہ سنتے اور اس سے اثر لیتے ہیں۔

جناب آغا صاحب کا یہ مرثیہ بھی مخصوص حضرات کے نظریات اور ہم محبین محمدؐ و آلِ محمدؐ کے لئے اسی قسم کی ایک پیش کش ہے۔ خداوند عالم آغا صاحب کے توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ اور انہیں فنِ مرثیہ گوئی میں اس سے بھی بلند مدارج تک پہنچائے۔ اس دور میں یہ جذبہ و خلوص لائق صد احترام ہے۔ بلکہ ان جیسے ذہین افراد کا مرثیہ کی طرف راغب ہونا نیک فال ہے۔ میں آغا صاحب کو اس کی حسن نیت پر مبارکباد دیتا اور ان کے مرثیے کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہوں

مصنّف کی چند کتابیں

۱۔ جواہر انیس : بارہ مرثیے، بحث اور مقدمہ
انیس کے منتخب مرثیے مجلس ترقی ادب لاہور کی صد سالہ یاد انیس کے موقعہ پر
مطبوعہ وقیع پیش کش۔

۲۔ انیس کے پانچ قدیم قلمی مرثیے: اشاعت طلب

۳۔ خلیق اولادان کے دو قدیم قلمی مرثیے: اشاعت طلب

۴۔ بیاض مراثی، گدا، مسکین، آشفتہ

۵۔ بیاض تذکرہ مرثیہ گویاں: مطبوعہ شیخ مبارک علی بک سیلر لاہور

۶۔ دبیر کے چند قلمی مرثیے: اشاعت طلب

۷۔ تذکرہ ریاض الفردوس: مطبوعہ شیخ مبارک علی بک سیلر لاہور

۸۔ تاریخ عزاداری: اشاعت طلب
اس کا انگریزی خلاصہ "عزاداری" کے نام سے پیر ابراہیم ٹرسٹ کراچی نے شائع کیا ہے۔

۹۔ کلیات آتش: مقدمہ و ترتیب دو جلدیں: مجلس ترقی ادب لاہور

۱۰۔ کلیات غالب: مقدمہ و ترتیب تین جلدیں۔ مجلس ترقی ادب لاہور

۱۱۔ عود ہندی: مقدمہ و تحقیق، مجلس ترقی ادب لاہور

۱۲۔ اردوئے معلّٰی: مقدمہ و تحقیق، مجلس ترقی ادب لاہور

۱۳۔ مکاتیب آزاد: مقدمہ و ترتیب، مجلس ترقی ادب لاہور

۱۴۔ مثنویات حالی: مقدمہ و ترتیب، شیخ مبارک علی لاہور

ناشر

سیّد عابد مرتضیٰ ــــــ حرمت سٹریٹ
مغلپورہ لاہور (پاکستان)